مجلس ادارت

معارف کا زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے　　فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ　ہوائی ڈاک　پندرہ پونڈ　یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک　　پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج ۔ اسٹریچن روڈ ۔ کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے ، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے ، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا ۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں ۔

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی ۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ——— رقم پیشگی آنی چاہیے ۔

جلد ۱۴۹ ۔ ماہ ذوقعدہ ۱۴۱۲ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۹۲ء ۔ عدد ۵

مضامین

شذرات

آزادی سے پہلے اور اس کے بعد کے ہندوستان میں بڑا فرق ہوگیا ہے۔ اگر یہ فرق خوش آیند ہوتا تو اس کا خیر مقدم کیا جاتا۔ اور ان لوگوں کی ستایش کی جاتی جو اس عرصہ میں ملک کے سیاہ و سفید کے مالک رہے ہیں۔ اور فخر سے کہا جاتا کہ انھوں نے اپنے تدبر، خوش انتظامی، لیاقت، محنت اور خون پسینہ سے درخشاں ہندوستان کی تعمیر کی ہے۔ لیکن آزاد ہندوستان کی خوبی و خوش نمائی کے پہلو بہت کم ہیں اور اس کے حال زار اور بد نمائی کے رخ گوناگوں ہیں۔ اس کی داستان کبھی فرصت سے سنی اور سنائی جائے گی۔ اس وقت تو صرف مسلمانوں کے تعلق سے بعض باتیں عرض کرنی ہیں کیونکہ ہندوستان کے نئے نقشے میں انھی کی تصویر سب سے زیادہ دھندلی اور اس قدر بدلی ہوئی ہے کہ ع ہمیں سے آج اپنی شکل پہچانی نہیں جاتی

مسلمانوں کی نئی نسل پرانی نسل سے بہت کچھ مختلف ہوگئی ہے۔ بعض گھرانوں کے دونوں نسلوں کے افراد کی تہذیب و معاشرت، رہن سہن، بول چال، مزاج و عادت، طور طریق، وضع قطع، لباس پوشاک، فکر و عمل اور نظریہ و خیال میں اس قدر مغایرت ہے کہ یہ دو خاندانوں یا دو علاقوں اور دو قوموں کے افراد معلوم ہوتے ہیں۔ یہی نہیں نئی نسل کو اپنے دین و مذہب، عقائد و اعمال، اپنی تاریخ و تہذیب اور تمدن و کلچر سے کوئی واسطہ اور لگاؤ نہیں رہ گیا ہے۔ وہ اپنی روایات، قومی و ملی تشخصات، اپنی تعلیم و تہذیب اور زبان و ثقافت سے بیگانہ ہو چکی ہے۔ اس پر اپنی قوم و ملت سے زیادہ دوسروں کے مذہب و ملت کا اثر چھاتا جا رہا ہے۔ اس کا لہجہ، ٹون اور طرز گفتگو اتنا بدل گیا ہے کہ الناس علیٰ دین ملوکہم کا مقولہ بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔

دینی و اخلاقی زبوں حالی اور تہذیبی و معاشرتی بحران ہی کی طرح مسلمانوں کی معاشی بد حالی

اور تعلیمی پس ماندگی بھی بڑھتی جارہی ہے۔ اور عملاً وہ ادنیٰ درجہ کے شہری ہوگئے ہیں، ملک میں نہ ان کی کوئی قدر و قیمت ہے اور نہ وزن و اہمیت، فسادات میں جان و مال کا ضیاع اور عزت و آبرو کا لوٹا جانا ان کا مقدر بن گیا ہے۔ وہ راتوں کی سیاہی کا کیا گلہ کریں جب دن ہی کالے ہوگئے ہیں۔ ارباب سیاست انھیں کھلونے دیکر بہلانا اور الیکشن کے موقع پر ان کی زبانی ہمدردی کی دو چار دلفریب باتیں کہہ کر ان کا حساب چکانا چاہتے ہیں ظلمت ایام کی اس سازش میں جہاں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت، سیاسی تنگ نظری اور اکثریت کا تعصب اور جارحانہ رویہ شامل ہے وہاں خود مسلمانوں کی بھی اپنی تعمیر و ترقی کے مسائل سے عدم دلچسپی، ان کے مذہبی و گروہی اختلافات، تعلیم سے محرومی، اس کی جانب سے سراسر بے توجہی اور ان کے سیاسی شعور و بصیرت کے فقدان کو بھی بڑا دخل ہے۔

اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ایک طرف تو مسلمان اپنے دین و مذہب، اپنی تاریخ و تہذیب اور اپنی روایات اور اصل خصوصیات کو ترک کرتے جا رہے ہیں اور دوسری طرف ملک میں وہ نہایت بے اثر اور غیر اہم ہوگئے ہیں۔ اور یہ ایسا المیہ ہے جس پر واقعی ایمانی و اسلامی حرارت رکھنے والے اور ملی و قومی غیرت و حمیت میں سرشار، دردمند مسلمانوں کے دل جل جل کر کباب ہو رہے ہیں۔ اور ان کی آنکھوں سے خون کے آنسو رواں ہیں وہ حیران ہیں کہ جس قوم کا ماضی اتنا شاندار رہا ہو، جس کے ہاتھوں میں قوموں کی باگ ڈور تھی، جس نے اپنے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا سکہ دنیا پر بٹھا دیا تھا اور جس نے یورپ کو بھی علم و ہنر کی روشنی عطا کی تھی اور جس کے زریں کارناموں کی بدولت ہندوستان جنت نشان بن گیا تھا، آج وہ کیوں اس قدر بے حس و حرکت اور دوسروں کا لقمۂ تر بن گئی ہے ؂

وہ زمانہ کیا ہوا جب مری آہ میں اثر تھا ٭ یہی چشم خوں فشاں تھی یہی دل یہی جگر تھا

باوجودیکہ مسلمان ملک کی بالا دست قوم کے رنگ وروپ کو اختیار کرتے جارہے ہیں۔ اور اکثریت کی چھاپ روز بروز ان پر گہری ہورہی ہے۔ اور وہ اس کی خوشنودی کے لیے اپنی خودی وخودداری ترک کرتے جارہے ہیں۔ پھر بھی وہ معتوب ہیں اور ساقی کی نگاہیں ان کی طرف سے پھری ہوئی ہیں اور ان کے حصہ میں درد تہِ جام بھی نہیں ہے، آئے دن انھیں غداری اور قوم ووطن فروشی کے طعنے سننا پڑتے ہیں۔ کبھی ملک میں یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی دھمکی انھیں دی جاتی ہے اور کبھی ان سے اپنے پرسنل لا کو تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ کبھی مسجدوں کو اکثریت کے حوالے کرکے ان کو مندروں میں بدل دینے پر زور دیا جاتا ہے۔ کبھی قومی دھارے میں ضم ہوجانے اور اپنا بھارتیہ کرن کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ کبھی عرب وایران اور مکہ ومدینہ کی طرف نظر اٹھانے کے بجائے کاشی ومتھرا کے گن گانے کی فرمایش کی جاتی ہے۔ اور کبھی محمد عربی فداہ ابی وامی صلی اللہ علیہ وسلم کا طوقِ غلامی نکال کر اکثریت کے پوروجوں کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈال لینے اور قرآن مجید کے بجائے وید اور گیتا سے رہنمائی حاصل کرنے کا اپدیش دیا جاتا ہے۔ آخر ع اس غم کی تلافی کیا ہوگی، اس درد کا درماں کیا ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل ذہنی وفکری ارتداد کے دہانے پر پہونچ گئی ہے۔ اور وہ اپنی حالت تبدیل کرنے اور غفلت ومدہوشی ترک کرنے کے لیے تیار نہیں دکھائی دیتی۔ لیکن اب بھی اس قوم میں خال خال وہ افراد نظر آتے ہیں۔ جو اشکِ سحرگاہی سے وضو اور دعائے نیم شبی کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں، انہی سے امید ہے کہ ہند میں سرمایۂ ملت محفوظ رہے گا۔ لیکن اس کے لیے قوم کو بیدار کرنے کی مہم چلانا ہوگی اور فکر وتدبیر اور تگ ودو کو بڑھانا ہوگا ع

نوا را تیز تر می زن چوں ذوقِ نغمہ کم یابی

مقالات

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مدینہ کے یہود

از مولوی بلال عبدالحی حسنی ندوی صاحب

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانہ میں ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے اس وقت وہاں دو طرح کے یہودی پائے جاتے تھے ایک وہ جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل سے تعلق رکھتے تھے، دوسری قسم ان یہودیوں کی تھی جن کا نسلی تعلق حضرت یعقوبؑ سے نہیں تھا بلکہ انھوں نے یہودی مذہب اختیار کرلیا تھا، آگے معلوم ہوگا کہ اس قسم کے یہودیوں کی تعداد بہت کم تھی تاہم بعض قبائل بنوانیف وبنومرید وغیرہ کے بارے میں تاریخی طور سے یہ ثابت ہے کہ وہ یہودی ہوگئے تھے۔

نسلی یہودیوں کی مدینہ منورہ میں آمد کا زمانہ اور اس کے اسباب

مدینہ میں یہود کے سکونت پذیر ہونے کے زمانے اور یہاں آکر ان کے آباد ہونے کے اسباب ومحرکات کے بارے میں مورخین ومحققین کا بڑا اختلاف ہے، علامہ سمہودی تاریخِ مدینہ کے مشہور عالم ہیں ان کی مشہور تصنیف وفاء الوفا اس موضوع پر ایک اہم مرجع خیال کی جاتی ہے" وہ کلبی کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ یہود مدینہ منورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں آباد ہوچکے تھے، انھوں نے یاقوت حموی

کے حوالہ سے بھی اسی طرح کا قول نقل کر کے اس رائے کو مرجح قرار دیا ہے۔ علامہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کے ساتھ حج کیا، واپسی میں جب یہ لوگ مدینہ سے گزرے تو انھوں نے اس کو ان اوصاف کا حامل پایا جو نبی آخر الزماںؐ کے مسکن کے بارے میں تورات میں بیان کیے گئے تھے، اس کی وجہ سے بعض لوگوں نے یہیں سکونت اختیار کر لی" (وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ جلد ا ص ۱۵۷)

یہود کو تورات سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے جو اس سرزمین میں قیام پذیر ہوگا جو حرّوں سے گھری ہوئی ہے اور جس میں کھجور کے باغات ہیں، اُس وقت مندرجہ ذیل چار جگہوں پر یہ خصوصیات منطبق ہوتی تھیں تیما، خیبر، فدک اور یثرب[1]، ابن النجار نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے مگر ان کے یہاں فدک کا ذکر نہیں ہے[2] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فلسطین میں آباد یہودیوں کو ان خصوصیات کی جامع سرزمین کی تلاش رہا کرتی تھی، اس سلسلہ کی دو اور روایتیں ملاحظہ ہوں جن میں حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں یہودیوں کے مدینہ میں آباد ہونے کا تذکرہ موجود ہے۔

پہلی روایت یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لوگوں کو جن مقامات پر غزوات کے لیے بھیجا ان میں یثرب بھی تھا اُس وقت یہاں عمالقہ آباد تھے، حضرت موسیٰؑ نے تاکید کی تھی کہ جس قبیلہ پر بھی فتح حاصل ہو اس کے ہر ہر فرد کو قتل کر دیا جائے، غلبہ پانے کے بعد انھوں نے ایسا ہی کیا لیکن ایک خوبرو اور قد آور نوجوان کے

[1] المدینہ فی العصر الجاھلی: الدکتور الخطراوی [2] اخبار المدینہ لابن النجار ص ۱۰

بارے میں وہ متردد ہوگئے اور اس کے معاملہ کو حضرت موسیٰؑ سے مشورے کے لیے موقوف رکھا لیکن جب یہ لوگ واپس آئے تو ان کی وفات ہو چکی تھی، بنو اسرائیل کو معلوم ہوا تو انھوں نے کہا اس کھلی نافرمانی کے بعد تم لوگ یہاں نہیں رہ سکتے۔ لشکر کے لوگوں نے ان کا بگڑا ہوا تیور دیکھا تو باہمی مشورہ سے مفتوحہ علاقوں میں جانے اور وہیں بود و باش اختیار کر لینے کا فیصلہ کیا، اس طرح یہ لوگ مدینہ منورہ میں آباد ہو گئے[1]۔

ڈاکٹر نعمان اعظمی ندوی نے اپنی تازہ ترین کتاب مجتمع المدینہ میں اس واقعہ کا ماخذ تورات کے سفر سموئیل اول کو قرار دیا ہے[2]۔

گو یہ روایت قطعی الثبوت نہیں تاہم اس بارے میں صریح و صحیح روایت کی عدم موجودگی میں اس سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں ہے۔ دوسری روایت جو زبیر بن بکار کی سند سے مورخین نے نقل کی ہے وہ یہ ہے:۔

حضرت موسیٰ و ہارون (علیہم السلام) حج کرنے گئے اور مدینہ منورہ سے گزرے تو وہاں کے یہود سے ان کو خوف محسوس ہوا چنانچہ یہ دونوں راہ بچا کر احد تشریف لائے، وہاں حضرت ہارونؑ پر سکرات کا عالم طاری ہوا تو حضرت موسیٰؑ نے ان کے لیے لحد تیار کی اور حضرت ہارونؑ سے کہا کہ آپ کا وقت قریب ہے تو حضرت ہارونؑ اٹھے اور لحد میں داخل ہوئے اور ان کی روح قبض کر لی گئی اور حضرت موسیٰؑ نے قبر پر مٹی ڈالی[3]۔

[1] اخبار المدینہ لابن النجار ص ۹ و ۱۰ والمدینہ فی العصر الجاھلی ص ۷۰، علامہ سہیلی نے اغانی کے حوالہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے مگر اسے ضعیف قرار دیا ہے (الروض الانف ج ۲ ص ۷ طبع جمالیہ مصر[2] ص ۳،۵ [3] عمدۃ الاخبار ص ۱۹ وغیرہ۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ میں یہود حضرت موسیٰؑ کے عہد ہی میں آباد ہو گئے تھے چنانچہ بعض مورخین کا رجحان اسی طرف ہے لیکن بعض دوسرے مورخین کا رجحان اس کے برعکس ہے، مشہور مورخ علامہ طبری کا خیال ہے کہ یہود بخت نصر کے مظالم سے تنگ آکر مدینہ منورہ میں آباد ہوئے تھے[1] علامہ سہیلی کی بھی یہی رائے ہے[2]، ڈاکٹر محمد طنطاوی ان مختلف روایات کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہودی جب رومیوں کے مظالم سے تنگ آگئے تو مدینہ منورہ آکر آباد ہوئے اور یہ پہلی صدی عیسوی کا واقعہ ہے[3] اسی موقف کو ڈاکٹر جواد علی نے اپنی کتاب تاریخ العرب قبل الاسلام میں اختیار کیا ہے[4]۔ اور مولانا[5] ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی نے بھی اسے ایک تاریخی حقیقت بتایا ہے :۔

"اس تاریخی حقیقت کو ترجیح حاصل ہے کہ یہود کی اکثریت جزیرۃ العرب میں عموماً اور شہر یثرب میں خصوصاً پہلی صدی مسیحی میں آئی مشہور یہودی فاضل ڈاکٹر اسرائیل ولفنسن لکھتا ہے : "۷۰ء میں جب رومی جنگ کے نتیجہ میں فلسطین اور بیت المقدس برباد ہو گئے اور یہود دنیا کے مختلف علاقوں میں بکھر گئے تو یہود کی بہت سی جماعتوں نے بلادِ عرب کا رخ کیا جیسا کہ خود یہودی مورخ جوزیفس کہتا ہے جو خود بھی اس جنگ میں شریک تھا اور عربی ماخذ بھی اس کی تائید کرتے ہیں"[6]

بعض کا خیال ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں یہود مدینہ

---

[1] تاریخ الامم والملوک ج ۱ ص ۳۸۱ [2] الروض الانف ج ۲ ص ۱۶ [3] بنو اسرائیل فی القرآن والسنۃ ص ۷۰ و مابعد [6] نبی رحمت ص ۱۷۲۔

آئے اور بعض نے حزقیال کے دورِ حکومت میں مدینہ میں ان کے اور یہود کے بود و باش اختیار کرنے کا ذکر کیا ہے انھوں نے ۷۱۰ء قبل مسیح سے ۶۹۰ ق م تک حکومت کی۔

مذکورۂ بالا تفصیل سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں :۔

۱۔ مدینہ منورہ میں حضرت موسیٰؑ سے بہت پہلے عمالقہ آباد تھے جو بڑی قوت و شوکت کے مالک تھے۔

۲۔ حضرت موسیٰؑ کے عہد میں کچھ یہودی بھی یہاں آئے۔

۳۔ بخت نصر نے جب بیت المقدس کو تاراج کیا اور یہودیوں پر مظالم ڈھائے تو مدینہ میں یہودیوں کی آبادی میں مزید اضافہ ہوا اور انکی قوت بھی بڑھی۔

۴۔ پہلی صدی مسیحی میں رومیوں کے دردناک مظالم سے تنگ آکر یہود یہاں بڑی تعداد میں آباد ہوئے اور انھوں نے یہاں کی آباد دوسری قوموں کو مغلوب کرکے بڑا اثر و اقتدار حاصل کیا، دور دور تک ان کی بستیاں پھیل گئیں اور یہاں کی معیشت پر ان کا پورا قبضہ ہو گیا اور تعلیمی و تمدنی حیثیت سے بھی ان کو بڑا عروج حاصل ہوا۔

عرب کے یہود

یہودیت ایک دعوتی مذہب تھا لیکن اپنے ناخلف متبعین کی وجہ سے یہ نسلی مذہب بن گیا تھا اور اس کو تبلیغ و دعوت سے سرے سے کوئی واسطہ نہیں رہ گیا تھا، یہی وجہ تھی کہ مدینہ میں یہود کے غیر معمولی اثر و رسوخ کے باوجود اس مذہب کو بڑی محدود تعداد میں عربوں نے اختیار کیا تھا، پہلے گزر چکا ہے کہ صرف دو تین قبائل ہی نے من حیث القبیلہ یہودیت اختیار کی تھی، ان کے علاوہ بعض اشخاص نے انفرادی حیثیت سے بھی یہ مذہب اختیار کیا تھا جیسے کعب بن اشرف جس کا تعلق قبیلہ طے سے تھا۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جن لوگوں نے یہودی مذہب اختیار کیا تھا انھوں نے یہود کی دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں اسے قبول نہیں کیا تھا بلکہ اس کے کچھ اور ہی اسباب تھے، ایک سبب تو یہودیوں کا علمی و تمدنی دباؤ تھا دوسرے سبب کا ذکر سنن ابی داؤد کی اس روایت میں ملتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

"مدینہ میں دستور تھا کہ عورت کے بچہ نہ ہوتا تو وہ نذر مانتی کہ اگر اس کے بچہ پیدا ہوا اور وہ زندہ رہا تو وہ اس کو یہودی بنائے گی چنانچہ جب بنو نضیر جلا وطن کیے گئے تو ان میں انصار کے بہت سے بچے موجود تھے اس لیے وہ کہنے لگے کہ ہم اپنے بچوں کو نہیں جانے دیں گے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (بقرہ: ۲۵۶) دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں"۔ (سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد باب الاسیر یکرہ علی الاسلام)

یہاں اس بات کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ایک طرف تو بعض مورخین کا خیال یہ ہے کہ کوئی بھی عرب قبیلہ من حیث القبیلہ یہودی نہیں ہوا جیسا کہ ابتدا میں گزرا مگر دوسری طرف بعض مورخین نے دعویٰ کیا ہے کہ مدینہ اور اطراف مدینہ میں کوئی نسلی یہودی نہیں تھا بلکہ یہاں کے تمام باشندے عرب تھے۔ یعقوبی کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے[1] لیکن نہ اس کی کوئی واضح دلیل موجود ہے اور نہ ہی قرآنی سیاق اور واقعات و شواہد سے اس کی تائید ہوتی ہے بلکہ قرآن مجید کا انداز تخاطب

[1] المدینۃ فی العصر الجاہلی ص ۲۷، ۳۷، بعض نے یہی قول علامہ حموی کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن علامہ سمہودی نے ان کا جو قول وفاء الوفا میں نقل کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسبت صحیح نہیں ہے۔

اس کے برعکس ہے چنانچہ وہ مدینہ کے یہود کو بھی بنی اسرائیل کہہ کر خطاب کرتا ہے جو اس کی واضح دلیل ہے کہ وہ نسلی یہود ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہوگا کہ وہ سب کے سب نسلی یہود تھے اور ان میں کوئی بھی عرب نہ تھا اسلیے کہ روایات اور واقعات اس کا ساتھ نہیں دیتے اور یہ بات قرآنی سیاق کے خلاف بھی نہیں ہے اسلیے کہ بنی اسرائیل کے خطاب میں یہود کی اکثریت کی رعایت مدنظر رکھی گئی ہے کیونکہ عرب کے یہودیوں کی تعداد تو بہت ہی کم تھی۔

مدینہ منورہ کے یہودی قبائل علامہ سمہودیؒ کی تحقیق کے مطابق یہودی قبائل کی تعداد ۲۰ سے زیادہ تھی، جمہور مورخین بھی اسی کے قائل ہیں لیکن بعض نے ۱۲ اور بعض نے اس سے کچھ کم یا بیش تعداد لکھی ہے، جن مورخین نے کم تعداد بتلائی ہے انھوں نے بطون کو اصل قبیلوں میں ضم کر دیا ہے اور جنھوں نے تعداد زیادہ بتلائی ہے انھوں نے بطون کا الگ سے ذکر کیا ہے۔ راقم کو جن بطون کا نام مل سکا ان کا بھی ذکر کر دیا ہے اس طرح قبائل کی تعداد ۳۵ تک پہنچ گئی ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) **بنو انیف**۔ عربی قبیلہ ہے قبا میں ان کا قیام تھا۔

(۲) **بنو القُصیص**۔ یہ بھی بنو انیف کے ساتھ قبا ہی میں مقیم تھے۔

(۳) **بنو قریظہ**۔ یہ یہود مدینہ کے تین بڑے قبیلوں میں سے ایک تھا اس کا قیام حرۂ قریظہ میں وادی مہزور کے سرے پر تھا جو مدینہ کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔

(۴) **بنو عمرو**۔ یہ عربی قبیلہ ہے اور بنو قریظہ کے ساتھ ہی مقیم تھا۔

(۵) **بنو ھدل** یہ بھی بنو قریظہ کے ساتھ ہی مقیم تھے بعض مورخین نے اس کا نام بنو ہبدل لکھا ہے۔

(۶) **بنو نضیر** مدینہ کے یہود کے تین اہم قبیلوں میں سے ایک یہ بھی تھا، اس کا مسکن نواعم میں وادی مذینیب کے انتہائی حصہ پہ زہرہ میں تھا جو مدینہ کے جنوب مشرق میں واقع ہے اسی وادی میں کعب ابن اشرف کا مشہور قلعہ بھی تھا جو قبیلہ طے سے تھا اور جس کے والد نے یہودیت کو اختیار کر لیا تھا[1]

(۷) **بنو فریدہ** (۸) **بنو ماسکہ** بعض مورخین نے اسکو بنو ماسلہ کے نام سے ذکر کیا ہے۔

(۹) **بنو محمم** (۱۰) **بنو معاویہ** یہ مدینہ کے مشرق میں آباد تھے۔

(۱۱) **بنو زعورا** (۱۲) **بنو زید اللات**

(۱۳) **بنو قینقاع** یہ بھی یہود کے تین اہم قبیلوں میں سے ایک ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا[2] علامہ ابن حجرؒ اور سمہودی نے اسے حضرت یوسفؑ کی اولاد بتایا ہے، یہ قبیلہ صنعت اور زرگری میں مشہور تھا اس کا مسکن وادی بطحان میں تھا[3]

(۱۴) **بنو حجر** اس کا قیام زہرہ میں تھا جس کو اس وقت مدینہ کا سب سے بڑا علاقہ بتایا جاتا ہے

(۱۵) **بنو ثعلبہ** اس کا مسکن بھی زہرہ تھا، عبداللہ بن صوریا جس کو تورات

---

[1] آثار المدینۃ المنورۃ ص ۱۵۴ [2] وفاء الوفاء ج ۱ ص ۱۶۴ وسیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۵۱۵ [3] السیرۃ النبویۃ للعلامہ دحلان الشافعی علی ہامش السیرۃ الحلبیۃ ص ۲۔

کا بیٹا عالم بتایا جاتا ہے اسی قبیلہ کا تھا اور فطیون[1] بھی اسی قبیلہ سے ہوا کرتا تھا۔

(۱۶) **یہود جواثیہ** شمالی مدینہ میں احد کے قریب ایک جگہ کا نام ہے یہیں اس قبیلہ کا قیام تھا۔

(۱۷) **بنو عکوہ** (۱۸) **بنو مرابہ**۔

(۱۹) **یہود راتج** علامہ سمہودی کی رائے یہ ہے کہ یہ یہود بنو انیف ہیں جو راتج منتقل ہو گئے تھے۔ (۲۰) **یہود ثیراب**۔

(۲۱) **بنو ناغصہ** ابن النجار نے اس کو ناعصہ کے نام سے ذکر کیا ہے۔ شعب حرام میں ان کا قیام تھا، جیسا کہ ڈاکٹر خطراوی کا خیال ہے لیکن علامہ سمہودیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ بھی بنو انیف کے ساتھ قباہی میں مقیم تھے۔ شعب حرام والی روایت کو انہوں نے مرجوح قرار دیا ہے[2]

(۲۲) **یہود بالہ**
(۲۳) **یہود عنابس**
(۲۴) **یہود وابج**

علامہ سمہودیؒ نے ان کا تذکرہ کیا ہے جو مختلف علاقوں میں مقیم تھے[3]

(۲۵) **یہود بنو لقمعہ**
(۲۶) **بنو فزاربہ**

ان دونوں قبیلوں کا ذکر دسویں صدی کے شیخ احمد بن عبدالحمید عباسی نے اپنی کتاب عمدۃ الاخبار میں کیا ہے[4]

---

[1] فطیون عبرانی لفظ ہے جو ہر اس شخص کا لقب ہوتا تھا جو یہود کا سردار ہو (الروض الانف ج ۲ ص ۲۴) [2] وفاء الوفاء ص ۱۶۵ [3] ایضاً [4] عمدۃ الاخبار ص ۱۹۔

(۲۷) **بنو الحارث** ابن اسحاق نے بنو الحارثہ کے نام سے اپنی سیرت میں اس کو یہودی قبائل میں ذکر کیا ہے[1]۔ یہ شمال مشرق میں وادی قناۃ کے جنوبی حصہ میں مقیم تھے۔

(۲۸) **بنو عوف** (۲۹) **بنو ساعدہ** (۳۰) **بنو النجار** (۳۱) **بنو جشم** (۳۲) **بنو اوس**	ابن اسحاق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جس عہد نامہ کا ذکر کیا ہے اور جس کو آپ نے مدینہ منورہ ہجرت فرمانے کے بعد لکھوایا تھا اس میں ان قبائل کا ذکر بطور یہود کے موجود ہے۔

(۳۳) **بنو جفنہ** یہ بنو ثعلبہ کے بطون میں سے تھا۔

(۳۴) **بنو شطبیہ** سیرت و تاریخ کی کتابوں میں اس کو بھی یہودی قبائل میں درج کیا گیا ہے۔

(۳۵) **بنو زریق** بدبخت لبید بن اعصم کا تعلق جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا اسی قبیلہ سے تھا۔

سیل عرم کے بعد مدینہ میں اوس و خزرج کی آمد اور یہود پر ان کا غلبہ

یہود مدینہ میں امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان کو وہاں پورا غلبہ حاصل تھا کہ ملک یمن میں سیل عرم کا مشہور واقعہ پیش آیا جو در حقیقت وہاں کے باشندوں پر ایک عذاب تھا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا	پھر دھیان میں نہ لائے پس چھوڑ

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۵۱۶۔

عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ (سبا: ۱۶)	دیا ہم نے ان پر نالہ زور کا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیوی نعمتوں سے مالا مال اور انکے لیے ہر طرح کے عیش و تنعم کا سامان مہیا کیا تھا جیسا کہ ارشاد ہے:

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ	اور رکھی تھی ہم نے ان میں اور
الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا	ان بستیوں میں جہاں ہم نے
قُرًى ظَاهِرَةً (سبا: ۱۸)	برکت رکھی ہے بستیاں راہ پر نظر آتیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ	قوم سبا کو تھی ان کی بستی میں نشانی،
آيَةٌ جَنَّتَانِ عَنْ يَمِينٍ وَ	دو باغ داہنے اور بائیں، کھاؤ
شِمَالٍ كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ	روزی اپنے رب کی اور اس کا
وَاشْكُرُوا لَهُ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ	شکر کرو، دیس ہے پاکیزہ اور
وَرَبٌّ غَفُورٌ (سبا: ۱۵)	رب ہے گناہ بخشتا۔

اہل سبا کے سلسلہ وار سر سبز و شاداب علاقے تھے انہیں ہر طرح کی راحت کا سامان مہیا تھا اور وہ بالکل مامون تھے لیکن انھوں نے اللہ کی اس عظیم نعمت کی قدر نہ کی اور ان نعمتوں سے اکتا کر کہنے لگے:

رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا	پھر کہنے لگے، اے رب فرق ڈال
(سبا: ۱۹)	ہمارے سفر میں۔

تو اللہ تعالیٰ نے ان کو تاخت و تاراج کر دیا:

وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (سبا: ۱۹)	اور چیر کر کر ڈالا ٹکڑے۔

اس سیلاب میں بے شمار لوگ ہلاک ہوئے اور قوم سبا کا شیرازہ بکھر گیا اور جو باقی بچے ان میں سے کچھ حجاز کی طرف آئے یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں[1]۔ حجاز آنے والوں میں ایک شخص ثعلبہ بن عمرو تھا جس کے دو فرزند تھے ایک کا نام اوس اور دوسرے کا خزرج تھا ان کی اولاد مدینہ میں آباد ہوئی۔ یہ لوگ ایک مدت تک تو یہود سے علیحدہ زندگی بسر کرتے رہے پھر ان کا زور و اثر دیکھ کر بالآخر ان کے حلیف بن گئے[2]۔ ایک عرصہ تک یہ حالت باقی رہی لیکن اسی دوران اوس و خزرج کا قبیلہ پھیلتا گیا اور اسکو ایک طرح کی قوت حاصل ہو گئی اس سے یہود کو خطرہ محسوس ہوا چنانچہ انھوں نے معاہدہ فسخ کر دیا اور یہودی امرا نے اوس و خزرج پر طرح طرح کے مظالم ڈھانے شروع کر دیے[3]۔ ایک بدکار و ظالم یہودی امیر فطیون[4] نے تو یہ حکم جاری کیا تھا کہ جو[5] لڑکی بیاہی جائے پہلے وہ اس کے شبستان عیش میں آئے، یہودیوں نے تو اس حکم کو گوارا کر لیا لیکن انصار نے سرتابی کی اس زمانے میں ان کا امیر مالک بن عجلان تھا اپنی بہن کی شادی کے دن وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ وہ اس کے سامنے سے بے پردہ گزری مالک کو غیرت آئی اور گھر واپس آکر اس نے اپنی بہن کو سخت تنبیہ کی اس پر اس نے کہا کہ جو کل ہونے والا ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے، دوسرے دن حسبِ دستور جب مالک کی بہن دلہن بن کر فطیون

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام ص ۱۱-۱۲ ج ۱ اور وفاء الوفا ج ۱ ص ۱۶۶ اور اس کے بعد [2] سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۵۹ و اخبار المدینہ ص ۱۳ [3] اخبار المدینہ لابن النجار ص ۱۳ [4] فطیون سے متعلق حاشیہ گذر چکا ہے کہ یہ یہودی امیر کا لقب ہوا کرتا تھا۔ الروض الانف ج ۲ ص ۲۴۴ [5] یہود بھی اس حکم سے مستثنیٰ نہ تھے۔

کی خلوت گاہ میں گئی تو مالک بھی زنانے کپڑوں میں ملبوس سہیلیوں کے ساتھ ہو لیا اور موقع پا کر فطیون کو قتل کر ڈالا، اس واقعہ سے انصار کے حوصلے بڑھ گئے اور انھوں نے یہود کی قوت کو توڑنا چاہا لیکن یہ تنہا ان کے بس کا کام نہ تھا اسلیئے انھوں نے ملک شام سے مدد چاہی[1] یہاں ابو جبیلہ حکمراں تھا اور بعض روایات میں ہے کہ انھوں نے تُبّع سے مدد چاہی[2] تھی۔ ابو جبیلہ نے اوس و خزرج کا ساتھ دیا اور ایک بھاری فوج لے کر آیا پہلے تو اوس و خزرج کے افراد کو بلا کر انعام سے نوازا پھر رؤسائے یہود کی دعوت کی اور ایک ایک کو قتل کر ڈالا[3]۔ اس طرح یہود کا زور ٹوٹ گیا اور اوس و خزرج نے از سر نو قوت حاصل کر لی اس سے قبل ان کو اپنی کمزوری کی بنا پر یہود سے معاہدہ کی ضرورت پیش آئی تھی اور اب انہی قبائل سے خود یہود معاہدہ کرنے کے لیے مجبور ہوئے[4]، بنو نضیر اور بنو قریظہ کو تو شہر چھوڑ کر جانا اور اوس کی پناہ لینی پڑی، بنو قینقاع شہر ہی میں خزرج کی پناہ میں رہے اول الذکر دونوں قبیلوں سے ان کی ان بن تھی اور یہ قبیلہ ان سے قوت و سرمایہ داری میں بڑھا ہوا تھا[5]۔

---

[1] اخبار المدینہ ص ۱۳ [2] علامہ سمہودیؒ کا بیان ہے کہ اصل میں تو انھوں نے جبیلہ سے مدد مانگی تھی لیکن تُبّع نے بھی ساتھ دیا [3] یہ واقعہ وفاء الوفاء، سیرۃ النبی جلد اول مصنفہ علامہ شبلی نعمانیؒ اور دوسری کتبِ تاریخ و سیرت میں موجود ہے [4] نبی رحمت ج ۱ ص ۱۰۵ بحوالہ تاریخ العرب قبل الاسلام الدکتور جواد علی [5] صاحب سیرت حلبیہ بنو قینقاع کے بارے میں لکھتے ہیں۔ اشجع قوم من الیہود واشجعہم (ج ۲ ص ۲۷۰) علامہ شبلیؒ نے بھی اپنی کتاب سیرۃ النبی ج ۱ کے صفحہ نمبر ۲۹۵ پر یہی بات لکھی ہے دوسرے مورخین اور سیرت نگار بھی یہی لکھتے ہیں۔

اوس وخزرج کا باہمی جدال و قتال

یہودیوں کی اس پسپائی کے بعد اوس وخزرج ایک مدت تک امن وچین سے زندگی گزارتے رہے لیکن مکر و سازش یہود کی سرشت میں داخل ہے، ان کو اوس وخزرج کا اتحاد واستحکام ایک نظر نہیں بھاتا تھا اس لیے وہ دن ورات ان میں انتشار پیدا کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے گو خود ان کی صفوں میں بھی اتحاد نہ تھا تاہم وہ اپنی کوشش میں برابر لگے رہے بالآخر ان کی کوششیں رنگ لائیں اور وہ اوس وخزرج کے درمیان تفرقہ ڈالنے میں کامیاب ہو گئے چنانچہ ان میں جنگ وجدال شروع ہو گیا اور اس کا سلسلہ ایک سَو بیس[12] سال تک جاری رہا جنگ بعاث اسی سلسلہ کی کڑی ہے جس میں ان کی معیشت کی بربادی کے علاوہ ان کے اہم ترین افراد بھی کام آئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور انھوں نے اسلام قبول کیا تو اس عظیم نعمت کی بدولت اللہ نے انکے اندر الفت ومحبت پیدا کردی ارشاد ہے:

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ	اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر
اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ	جب تھے تم آپس میں دشمن پھر الفت
بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ	دی تمھارے دلوں میں اب ہو گئے
بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا (آل عمران: ۱۰۳)	اسکے فضل سے بھائی ۔

لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس کے بعد بھی یہودیوں نے اپنی دسیسہ کاریوں میں کوئی کمی نہیں کی اور وہ برابر اوس وخزرج میں پھوٹ ڈالنے اور انہیں تباہ وبرباد کرنے کی سعی وسازش کرتے رہے۔

یہود کا دینی ودنیاوی تفوق

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

"یہ لوگ علوم انبیاء ومعارف اولیاء کے حامل تھے، مالدار تھے، ساہوکار تھے ساتھ ہی ساتھ سفلی عملیات سحر وکہانت کے بھی بڑے ماہر تھے، حجاز کی آبادی میں اس دینی ودنیوی تفوق کی بنا پر اہمیت انہیں اس وقت اچھی خاصی حاصل تھی، مشرکین ایک طرف تو ان کے علم وفضل کے قائل اور ان کی دینی واقفیت سے مرعوب تھے تو دوسری طرف اکثر ان کے قرضدار بھی رہا کرتے تھے گویا دینی ودنیوی اکثر حاجتوں میں انہیں کو مشکل کشا جانتے تھے اور جیسا کہ عام قاعدہ ہے کہ منظم وتاہر قوموں کے تمدن سے کمزور اور غیر منظم قومیں مرعوب ومتاثر ہو جاتی ہیں مشرکین عرب بھی ان سے متاثر تھے" (تفسیر ماجدی ج ۱ ص ۸۶)

مولانا کے اس بیان سے یہود کی عظمت وبرتری کا ایک اجمالی خاکہ سامنے آجاتا ہے، اب ان کی معاشی، اقتصادی، تعلیمی، ثقافتی، سیاسی واجتماعی حالت کا جائزہ تفصیل سے لیا جاتا ہے۔

معاشی واقتصادی حالت

اوس وخزرج کی آمد سے پہلے زراعت وصناعت پر یہود کا پورا غلبہ تھا اور تجارت ہی ان کا خاص پیشہ تھا اور ان کے بعض افراد ممتاز تاجر کی حیثیت سے نہایت مشہور تھے چنانچہ سلام بن ابی الحقیق تاجر اہل الحجاز کہلاتے تھے۔ گیہوں، جو، کھجور اور شراب کی منڈیوں پر یہود ہی قابض تھے[1]، اس لیے اقتصادی حیثیت سے ان کی حالت بہتر تھی، انصار غالب ہوئے تو زراعت پر ان کا قبضہ ہو گیا لیکن صنعت وتجارت اب بھی یہود ہی کے ہاتھ میں رہی[2]، اور زراعت کی کمی پورا کرنے کے لیے انھوں نے

---

[1] بنو اسرائیل فی القرآن والسنۃ ص ۹، [2] ان قبائل میں بنو قینقاع (بقیہ ص ۳۴۰ پر)

سودی قرضے دینے شروع کر دیے جس سے ان کو کافی آمدنی ہوئی۔

سیاسی استحکام کے باوجود اوس و خزرج کے معاشی عدم استحکام کے کئی اسباب تھے۔

پہلا سبب خود ان کی باہمی معرکہ آرائیاں تھیں جنھوں نے ان کو تباہ کرکے رکھ دیا اور جن کی وجہ سے یہودیوں کو پھر سر اٹھانے کا موقع ملا۔

دوسرا سبب یہود کی بدباطن فطرت ہے، ان کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ وہ نہایت حریص و طماع اور ذخیرہ اندوز واقع ہوئے تھے اس کے مقابلہ میں عرب اپنے بدوی مزاج کی وجہ سے مستقبل کی فکر سے آزاد اور مال جمع کرنے کے معاملہ میں بے پروا تھے ان کی مہمان نوازی اور فیاضی ضرب المثل تھی اس لیے وہ اکثر یہود سے قرض لینے کے لیے مجبور رہتے تھے۔

تیسری وجہ زراعت کا پیشہ ہے جس میں عام طور سے قرض لینے کی ضرورت پیش آتی ہے اور انصار کا سارا دار و مدار اسی پر تھا اس بنا پر یہود کو انکے استحصال کا پورا موقع ملا اور سیاسی مغلوبیت کے باوجود انکی معاشی برتری قائم رہی۔

اقتصادیات پر تسلط کیوجہ سے یہود منڈیوں میں من مانی کرتے، مصنوعی قلت پیدا کرکے چوربازاری اور ذخیرہ اندوزی سے کام لیتے اسلیے مدینہ کی اکثریت انکی دھاندلی، سود خوری، نفع اندوزی اور ان جیسی دوسری شرمناک حرکتوں کیوجہ سے ان سے نفرت کرنے لگی تھی[1] لیکن یہ واضح رہے کہ نفرت کا سبب انکے یہ گھناونے افعال تھے ورنہ اہل مدینہ کے نزدیک انکا علمی و دینی تفوق مسلم تھا۔ (باقی)

(بقیہ ص ۳۳۹) خاص طور سے زرگری کا پیشہ کرتے تھے اور چونکہ بہادری و شجاعت میں بھی وہ بڑھے ہوئے تھے اسلیے انکے پاس جنگی اسلحے کا ذخیرہ بھی رہتا تھا۔ سیرۃ النبی ج ۱ ص ۳۹۵ [1] بنو اسرائیل فی القرآن والسنۃ ص ۷۹۔

داراشکوہ کے عارفانہ دعوے

از

ڈاکٹر عبدالرب عرفان، کامٹی

(۲)

حصولِ معرفت کا دعویٰ

داراشکوہ کی ملاشاہ سے پہلی ملاقات ۱۲ ذی الحجہ ۱۰۴۹ھ کو ہوئی[1]۔ اس پہلی ہی ملاقات میں وہ ان سے بیعت بھی ہو گیا۔ اس ملاقات کی روداد وہ یوں بیان کرتا ہے:

"پہلی بار جب یہ فقیر ان کی خدمتِ شریف میں پہنچا تو چونکہ انھوں نے مجھے کبھی نہیں دیکھا تھا، میرا نام پوچھا۔ میں نے کہا: فقیر۔ انھوں نے کہا: فقیر کا بھی ایک نام ہوتا ہے۔ میں نے کہا: حضرت پر ظاہر ہے۔ فرمایا: معلوم ہو گیا اور فقیر کا ہاتھ پکڑ کر پہلو میں بٹھا کر اس پہلی بار ہی میں اتنی زیادہ نوازشیں اور عنایتیں کیں جو خواب و خیال میں بھی نہ تھیں[2]"

پھر دارا نے اپنے آنے کا مقصد بیان کرنے کی غرض سے ملاشاہ کی یہ رباعی پڑھی:

آن گم شدہ باللہ خدا آگاہ است — افتادہ یقین بدست ملاشاہ است
نزدیک نزدیک درآی و آہستہ بگو — در گوش کسی کہ طالب اللہ است[3]

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۷۰ [2] ایضاً ص ۷۱ [3] ایضاً: ص ۲-۱۷۱۔

(وہ گم شدہ، خدا کی قسم، خدا شناس ہے ، وہ بالیقین ملا شاہ کے ہاتھ آگیا ہے ؛
چپکے چپکے آ (اور یہ بات) دھیرے سے کہہ ، اس شخص کے کان میں جو اللہ کا طالب ہے)

یہ سن کر ملا شاہ نے کہا: تمھارا مطلب یہ ہے اور تم اس کام کے لیے آئے ہو؟ دارا نے کہا:
درحقیقت اس مطلب کے سوا کوئی اور مطلب مقصود ہی نہیں، اس کے سوا ہر کام
بے سود ہے۔ اس بات سے ملا شاہ بہت خوش ہوئے اور مزید عنایت کے ساتھ
فرمایا: "میں نے اس گم شدہ کو پالیا" اور کہا: "یہ رباعی بھی ہم نے کہی ہے":

آن کس کہ زروی صدق دولتخواہ است آخراو را بسوی دولت راہ است
دولت یعنی معرفت اللہ است این دولت درخانۂ ملا شاہ است[1]

(وہ شخص جو صدق دل سے دولت کا طالب ہے ، آخر اسکے لیے دولت کی جانب راہ ہے
دولت یعنی اللہ کی معرفت ہے ، یہ دولت ملا شاہ کے گھر میں (موجود) ہے۔)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس "گم شدہ" کو اپنے "دام عقیدت" میں اسیر کرنے کا منصوبہ
بنا کر ملا شاہ نے منقولہ بالا دونوں رباعیاں پہلے ہی کہہ رکھی تھیں۔ پہلی رباعی اپنے کسی
ایسے مرید کے توسط سے جسے دارا کا تقرب حاصل رہا ہوگا، اس تک پہنچا دی۔ پھر جب
وہ اچانک ان کی خدمت میں آ پہنچا (یا کسی تدبیر سے پہنچایا گیا) تو رسمی تعارف کے بعد
اس "گم شدہ" کی بازیافت کا اعلان فرما دیا۔ پھر دوسری رباعی سنا کر "دولت
معرفت" سے اپنا گھر معمور ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا۔ دولت معرفت سے دارا کا دل
پل بھر میں کس طرح مالا مال ہوتا ہے، خود اسی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:
"فقیر بے اندوہ محمد دارا شکوہ کہتا ہے کہ چونکہ میں ہمیشہ بادشاہ مطلق اور مالک یگانہ

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۱۶۲ -

سے خواہش کرتا تھا کہ وہ مجھے اپنے دوستوں اور چاہنے والوں میں شامل کر لے اور اپنی
معرفت کے جام سے ایک گھونٹ چکھا دے اور دلی مراد کو پہنچا دے اور غیر خود سے
رہائی دلا دے ..... اس عاجز کے سوال کو اس نے قبولیت بخشی جمعرات کے روز
پچیس سال کی عمر میں، میں نیند میں تھا کہ ہاتف نے آواز دی اور چار بار کہا کہ جو چیز
روئے زمین کے بادشاہوں میں سے کسی کو میسر نہیں ہوئی خدائے تعالیٰ نے تجھے
عطا کی۔ بیدار ہونے کے بعد میں نے سوچا کہ اس طرح کی سعادت یقیناً معرفت ہوگی
...... اور میں ہمیشہ اس عظیم دولت کا طالب رہنے لگا یہاں تک کہ (خدا نے)
مجھے ۱۲ ذی الحجہ ۱۰۴۹ھ کی رات جب میں پچیس سال کا تھا، اپنے دوستوں میں سے
ایک کی خدمت میں پہنچا دیا اور اس عزیز کو مجھ پر اتنا مہربان کر دیا کہ کوئی شخص
اس سے جتنا کچھ ایک سال میں پاتا تھا، میں نے پہلی رات میں پا لیا اور جتنا کچھ ایک
سال میں پاتا تھا مجھے ایک ماہ میں میسر آگیا اور اگر کوئی طالب کسی دوسرے (مرشد)
کے پاس برسوں کی ریاضت اور مجاہدے کے بعد پاتا تھا، سو میں نے اس کے فضل سے
ریاضت کے بغیر پا لیا اور دفعتہً دونوں جہان کی محبت میرے دل سے نکل گئی اور
میرے دل پر فضل و رحمت کے دروازے کھل گئے اور میں جو چاہتا تھا اس نے
مجھے دیا۔ اب اگرچہ میں اہل ظاہر ہوں لیکن ان میں سے نہیں ہوں اور ان کی
بے خبری اور آفت کو جان گیا ہوں اور اگرچہ درویشوں سے دور ہوں مگر ان
میں سے ہوں[1]"

اس دعوے کا تجزیہ | منقولہ بالا عبارت کا فقرہ "آنچہ ہیچ یکی از پادشاہان روی زمین

[1] سکینۃ الاولیا (تہران): ص ۶ - ۵ -

میسر نشدہ ....." اس "معرفت" کی تخصیص کر رہا ہے جو دارا کو مطلوب تھی۔ اسے اپنی اس معرفت پر، جس کی حقیقت خود اس پر روشن تھی، قناعت کرکے اور ہندوستان کے تخت و تاج سے دست بردار ہو کر گھاٹے کا سودا کرنا منظور نہیں تھا۔ اس کی نگاہیں تختِ طاؤس پر مرکوز تھیں۔ اگر اس کے "دل سے دنیا کی دوستی نکل جانے" کے دعوے میں صداقت ہوتی تو وہ "کینہ جوئی" اور "قابوطلبی" کے ہاتھوں مجبور ہو کر نہ اپنے بھائیوں کی مہموں کو ناکام بنانے کی کوشش کرتا[1] اور نہ شاہجہاں کی علالت کے دوران اپنی بعض غیردانش مندانہ اور خلاف مصلحت حرکتوں سے ایسے حالات پیدا کرتا جو تخت نشینی کی خوں ریز جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوتے۔ علاوہ بریں عبارت کے اختتامی جملے میں اس کا اصل مدعا یہ ہے کہ لوگ اسے ایک ایسی شخصیت تسلیم کر لیں جس کا ظاہر شاہی ہو اور باطن درویشی۔ اب اس پس منظر میں "پادشاہان روی زمین" کے ممتاز ناموں کو شمار کیجیے ان میں حضرت سلیمانؑ اور حضرت یوسفؑ کے نام بھی نظر آئیں گے۔ کیا دارا کا یہ دعویٰ کہ "جو چیز روی زمین کے بادشاہوں میں سے کسی ایک کو بھی میسر نہیں، خدا نے اسے عطا کی" در پردہ ان پر اپنی فوقیت جتانے کے مترادف نہیں؟ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ انتہا پسند صوفیوں کے نزدیک معرفت کو نبوت پر برتری حاصل ہے[2]۔ اسکی

[1] شاہنواز خاں جسے عالمگیر دشمن مورخوں کی صف اول میں شمار کیا جاتا ہے، لکھتا ہے کہ داراشکوہ "کینہ جوئی" اور "قابوطلبی" کی خاطر اپنے بھائیوں کی مہموں کو ناکام بنانے کی کوشش کرتا تھا (مآثر الامرا، جلد اول: ص ۲۶۹) [2] نبوت پر معرفت کی برتری کے بالواسطہ اظہار کی غرض سے دارا اپنے پیر کا بیان کردہ یہ واقعہ نقل کرتا ہے کہ وہ (ملا شاہ) دریائے لاہور میں اپنا لباس دھو رہے تھے کہ حضرت خضرؑ نمودار ہوئے، انھیں سلام کیا اور فرمایا: تو شغل میں مصروف ہے، لباس مجھے دے (بقیہ ص ۳۴۵ پر)

تائید دارا کے درج ذیل استفسار اور شیخ محب اللہ الٰہ آبادی کے جواب سے ہوتی ہے۔

دارا نے شیخ سے دریافت کیا:

"انبیای سابق را معرفت توحید بود یا نہ؟"[1] سابق نبیوں کو معرفت توحید حاصل تھی یا نہیں؟

شیخ نے جواب میں تحریر فرمایا:

"پوشیدہ نہ رہے کہ کمالِ معرفت جو صوفیوں کا ذوق ہے، مرتبۂ نبوت کے لیے لازم رہا ہو، یہ معلوم نہیں اور تمام نبی اس مرتبے سے از روی فضل بہرہ ور رہے ہوں، یہ بھی لازم نہیں۔ مگر تمام سابق انبیا اس مرتبے سے پوری طرح بہرہ ور نہ رہے ہوں، ایسا بھی نہیں ہے، لیکن یقین کے ساتھ یہ معلوم ہوا کہ انکا نصب العین صفات کے حجابوں کے بغیر تجلی ذات تھی۔ انجام کار ان کے تابعین مرتبۂ توحید تک پہنچے ہیں[2]"

شیخ نے بڑے محتاط انداز میں اپنی بات کہی ہے مگر دارا کو اس میں نبوت پر معرفت کی برتری کا پہلو آخری جملے میں مل گیا۔ اس کا اصل مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ وہ ان نبیوں کی مثالوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے، جو منصب نبوت کے ساتھ ہی دنیاوی حکومت پر بھی فائز کیے گئے تھے، خود کو معرفت کی دولت سے بہرہ یاب اور اس دلیل سے ہندوستان کی حکومت کا سزاوار بلکہ حق دار ثابت کر سکے۔ چنانچہ ریاضت کے بغیر سلوک کے جملہ مراحل قابل صد رشک برق رفتاری سے طے کرنے کی بات، اہل ظاہر کے لباس میں ہونے کے باوجود ان سے بریت کا اظہار

(بقیہ ص ۳۴۴) میں دھو دیتا ہوں اور تو اپنا شغل جاری رکھ۔ ملا شاہ نے جواب دیا کہ وہ اپنا دونوں کام ایک ساتھ کریں گے (سکینۃ الاولیا: ص ۱۴۰) [1] رقعات عالمگیر، مرتبہ نجیب اشرف ندوی: ص ۲۶۳ [2] ایضاً

اور درویشوں سے دور رہتے ہوئے ان کے زمرے میں شمولیت کا دعویٰ اس کے بیان کے وہ پہلو ہیں جو اس کی نیت کے فتور کی صاف غمازی کرتے ہیں۔ اس خیال کی تائید میں داراشکوہ کے ایک زبردست حامی سید محمد رضا جلالی نائینی کا ایک بیان نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ موصوف، جنھوں نے داراشکوہ کے کم و بیش تمام آثار کو ڈاکٹر تارا چند کے اشتراک سے مرتب کرکے شایع کیا ہے، اپنی تحریروں میں جا بجا اس کی حمایت فرماتے ہیں۔ کہیں اس پر عائد شدہ "الحاد و زندقہ" کے الزامات کے اندفاع میں اپنا سارا زورِ قلم صرف کرتے ہیں، کہیں اس کے قتل کو سیاسی اقدام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اس کے عارفانہ دعووں کے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی وقت معرفت اور تصوف میں اس مرتبے کو نہیں پہنچا کہ اپنے خاندان کے ظاہری مقام و جلال سے دل کو بے نیاز کر سکتا اور گوتم بدھ، ابراہیم بن ادہم کی تقلید میں امیری اور حکمرانی سے چشم پوشی کر سکتا۔"[1]

یہ سکینۃ الاولیا کے مقدمے سے مقتبس عبارت ہے۔ اس سے مترشح ہونے والا تشکیک کا پہلو ظاہر کرتا ہے کہ فاضل مقدمہ نگار (جلالی نائینی) کو دارا کی بلند پایہ ہونے کی (خود ساختہ) حیثیت کو تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ انھوں نے درست فرمایا کہ وہ اپنے ذی قدر خاندان کے ظاہری مقام و جلال کی سطح سے کسی بھی وقت اونچا نہیں اٹھ سکا، مگر نت نئے عارفانہ دعوؤں سے بھی کبھی باز نہیں آیا۔ اس میدان میں وہ اپنے پیر و مرشد (ملا شاہ) سے بھی بازی لے گیا۔ اس کا درج ذیل دعویٰ ملاحظہ فرمائیں:

[1] سکینۃ الاولیا (مقدمہ مرتب): ص چہل و چہار

سلطان الاذکار کی تدریس دارا نے اپنے پیر کے پیر شاہ میاں میر کے ایک خادم نور محمد کے حوالے سے شاہ صاحب کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ جو "گشایش" کسی اور جگہ چالیس سال میں ہوتی ہے، غارِ حرا میں ایک سال میں ہو جاتی ہے۔[1] رسالہ حق نما (سال تالیف ۱۰۵۶ھ) میں وہ لکھتا ہے کہ شیخ میاں جیو (شاہ میاں میر) نے غارِ حرا میں پورے بارہ سال "سلطان الاذکار" کے شغل میں بسر کیے۔[2] اس کے فیض سے انہیں "گشایش عظیم" کی دولت و سعادت نصیب ہوئی۔ انہیں یہ شغل بہت محبوب تھا اور وہ اپنے ارادت مندوں کو اس کی تعلیم بھی دیتے تھے مگر ایک سال سے پہلے کامیابی حاصل نہیں ہوتی تھی۔ اس کے برعکس دارا جن طالبوں کو "مشغول" کرتا تھا وہ دو چار ہی دنوں میں کامیاب و بامراد ہو جاتے تھے۔ اس کا سبب دارا یہ بیان کرتا ہے:

"ایشان بکنایہ و اشارہ میفر	وہ اشارہ و کنایہ میں فرماتے تھے
مودند و من تبصریح می گویم و	اور میں صراحت کے ساتھ بیان
بی پردہ می نمایم۔"[3]	کرتا ہوں اور بے پردہ اظہار کرتا ہوں۔

لیلۃ القدر کی دریافت ممکن ہے قارئین یہ تصور فرمائیں کہ دارا نے "سلطان الاذکار" کا یہ

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۱۱۴ [2] مشمولہ منتخبات آثار داراشکوہ (مرتبہ جلالی نائینی): ص ۴-۱۳۔ (شاہ میاں میر نے زندگی میں ایک بار بھی مکے کا سفر نہیں کیا۔ ان کے خادم نور محمد کی روایت کے مطابق ان کی راتیں غارِ حرا میں بسر ہوتی تھیں اور دن لاہور میں گزرتے تھے!!) تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں سکینۃ الاولیا: ص ۴-۱۱۳ اور خزینۃ الاصفیا جلد اول، از مفتی غلام سرور: ص ۱۵۷۔ یہ نکتہ بطور خاص ملحوظ رہے کہ شاہ صاحب نے نور محمد کو یہ بات بتاتے ہوئے "رازداری" برتنے کی سخت تاکید کی تھی۔ [3] رسالہ حق نما، مشمولہ منتخبات آثار داراشکوہ: ص ۱۴۔

کا درس شاہ میاں میر سے ان کی حیات میں لیا ہوگا اور ایک سال میں بامراد ہوا ہوگا۔ ان کی اطلاع کے لیے مکرر عرض ہے کہ شاہ میاں میر سے دارا کی صرف دو ملاقاتیں ہوئیں۔ ۱۰۴۵ھ میں شیخ اپنے سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔ اس کے باوجود دارا کا دعویٰ ہے کہ اس نے یہ شغل شاہ میاں میر ہی سے ان کی وفات کے تقریباً چھ سال بعد ۱۰۵۱ھ میں حاصل کیا اور وہ بھی صرف چند ثانیوں میں۔ یہ امر محال کیونکر ممکن ہو سکا، اسی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

"دوشنبہ ۲۸ رمضان المبارک ۱۰۵۱ھ کی رات میں خدا کی عنایت اور حضرت میاں جیو کی توجہ سے اس وقت جب رات کا ایک پہر باقی تھا، مجھے شب قدر مل گئی۔ میں شغل میں مصروف رو بقبلہ بیٹھا ہوا تھا کہ مجھ میں ایک اضطراب پیدا ہوا۔ میں نے اٹھ کر جنبش کی لیکن دل بیدار اور بیقرار تھا۔ صبح کے قریب ایک بلند روضہ جو رفعت اور حسن تعمیر کے درجۂ کمال کو پہنچا ہوا تھا اور جس کے اطراف میں ایک باغ تھا، دکھائی دیا۔ میں جان گیا کہ حضرت میاں جیو کا روضۂ مبارک ہے۔ اندر جا کر میں نے دیکھا کہ بہت آراستہ روضہ ہے اور بیچ میں ایک قبر ہے، لیکن حضرت میاں جیو قبر سے نکل کر گنبد کے باہر پاکیزہ لباس پہنے ہوئے کرسی پر بیٹھے ہیں۔ جب ان کی نظر مبارک مجھ پر پڑی تو انتہائی بشاشت سے مجھے اپنے پاس بلا کر بٹھا لیا اور عنایت فرمانے لگے اور میں ہر پل ان کے مبارک ہاتھوں اور پیروں کو تھامنے، چومنے اور آنکھوں سے لگانے لگا۔ عنایت بسیار کے بعد انھوں نے بہت سی شیرینی دے کر میرا ہاتھ تھاما اور فرمایا: آ، میں تجھے اپنے ایک شغل کا درس دوں۔ انھوں نے میرا چہرہ برہنہ کر دیا اور خود برہنہ رو ہو گئے اور میری دونوں شہادت کی انگلیاں میرے دونوں کانوں میں اتنے دباؤ کے ساتھ داخل کیں کہ میں سراپا سلطان الاذکار ہو گیا اور آواز نے مجھ پر ہجوم کیا۔ انھوں نے مجھے سینے سے سینہ ملا کر آغوش مبارک میں لیا اور اس کے بعد (زمین پر) ڈال دیا۔ پھر میں بیخود ہو گیا۔ مجھے ایک روحانی دوا ملی اور ایک ایسی بات منکشف ہوئی جو نہ تحریر و تقریر میں سماتی ہے نہ عبارت و اشارت میں۔ مطلب حاصل ہو گیا۔ لذت دو چند ہو گئی۔ کامیابی پر کامیابی نصیب ہوئی اور نزدیکی اور دوری کا فرق مٹ گیا۔"[1]

منقولہ بالا دعوے کا تجزیہ

اس واقعہ نما داستان کے تجزیے کے سلسلے میں درج ذیل نکتے بطور خاص غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں:

(۱) دارا شکوہ نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ وہ رات جو اس کے لیے گوناگوں سعادتوں کی سوغات لے کر آئی تھی، کس جگہ بسر ہوئی تھی۔ آگرے یا لاہور کے کسی محل میں یا بحالت سفر پر تکلف شاہانہ سراپردات میں۔ تاریخ کے صفحات سے اس امر کا پورا ثبوت ملتا ہے کہ شاہجہاں سفر و حضر میں بیشتر اسے اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ شاہجہاں ۲۷ رمضان ۱۰۵۱ھ کو کہاں تھا، ہم تاریخ کے اوراق پر نظر ڈالتے ہیں۔ پتا چلتا ہے کہ وہ وسط شعبان ۱۰۵۱ھ میں لاہور سے کانوواہن کی شکارگاہ کا رخ کرتا ہے۔ چونکہ یہ تفریحی نوعیت کا سفر تھا اس لیے منزل بمنزل قیام کرتے ہوئے اواخر شعبان میں کانوواہن پہنچا ہوگا۔ یکم رمضان کو کانوواہن میں شاہجہاں کی موجودگی کا ثبوت عنایت خاں کے "شاہجہاں نامہ"

---

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۵۳-۵۴۔

سے دستیاب ہوتا ہے[1]۔ اسی مقام پر سلخ رمضان کو مراد بخش بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا[2]۔ گمان غالب ہے کہ اس تفریحی سفر میں داراشکوہ شاہجہاں کی معیت میں رہا ہوگا اور ۲۷ رمضان کی شب کانوواہن میں بسر کی ہوگی۔

(۲) چونکہ اس نے لیلۃ القدر کی دریافت کا دعویٰ کیا ہے، اس لیے اسکی بیان کردہ عجیب وغریب روداد کو درست مان لینے کی صورت میں اس پر یا اس کے کسی حصے پر خواب کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ لیلۃ القدر سے استسعاد کی اولین شرط شب بیداری اور عبادت ہے۔

(۳) ہزار مہینوں پر فضیلت رکھنے والی یہ رات ماہ رمضان کے آخری عشرے کی طاق عدد والی تاریخوں میں سے کسی ایک تاریخ میں واقع ہوتی ہے۔ وثوق کے ساتھ اس رات کا تعین نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ اس کی کوئی ظاہری علامت نہیں ہوتی۔ خود اس سے مستسعد ہونے والا بھی اپنی سعادت اندوزی سے بے خبر رہتا ہے۔ لہذا داراشکوہ کا دعویٰ کہ "لیلۃ القدر را...... دریافتم" اور وہ بھی صرف رات ہی نہیں، پہر کے بھی تعین کے ساتھ، کہاں تک قابل قبول ہے۔

(۴) ان واقعات کا تجزیہ بھی جن کی بنیاد پر داراشکوہ نے لیلۃ القدر کی دریافت کا دعویٰ کیا ہے اس کی ژولیدگیٔ خیال پر دلالت کرتا ہے۔ رات کے آخری پہر میں اسے ایک روضہ دکھائی دیا۔ اس نے فوراً جان لیا کہ وہ شاہ میانمیر کا روضہ تھا۔ بیان کے اس نقطے پر اس کا لہجہ صاف غمازی کر رہا ہے کہ شاہ میانمیر کی وفات کے بعد سے اس وقت تک ۔ کم و بیش چھ برس کے عرصے میں ۔ اسے ان کے روضے کی

---

[1] بادشاہ نامۂ عنایت خان انگریزی ترجمہ از بیگلی و دیسائی، آکسفورڈ: ص ۲۸۲ [2] ایضاً: ص ۲۸۳۔

زیارت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ وہ روضے کی بلندی، اس کے حسن تعمیر اور اطراف و جوانب میں باغ کی موجودگی کا ذکر نہ کرتے ہوئے صرف یہ لکھتا کہ "روضۂ مبارک حضرت میانجیو بنظر درآمد"۔ اس صورت میں تشکیک کا پہلو پیدا کرنے والے لفظ "دانستم" کے استعمال کی بھی ضرورت پیش نہ آتی۔

(۵) شاہ میانمیر کا اسے اپنے پاس بلانا، اس کا موصوف کے ہاتھ پیر کو چومنا اور آنکھوں سے لگانا ظاہر کرتا ہے کہ اس وقت وہ اپنے عنصری پیکر میں تھے اور داراشکوہ کے الفاظ میں "قبر سے باہر نکل کر بیٹھے ہوئے تھے"۔ نیز اپنے روضے سمیت اس جگہ موجود تھے جہاں اس وقت داراشکوہ قیام پذیر تھا۔ (غالباً کانوواہن کی شکارگاہ میں!)

(۶) سلطان الاذکار کے فیض سے "گشایش" کی تمنا میں شاہ میانمیر کو بارہ سال تک، بروایت نور محمد صرف راتیں غار حرا میں گذارنی پڑیں (دن میں وہ اپنے اصحاب کے ساتھ لاہور میں موجود رہتے تھے!!) اس عظیم شغل کا مکمل درس انھوں نے آن واحد میں داراشکوہ کو اس طرح دیا کہ اس کی شہادت کی انگلیاں اسکے کانوں میں فشار کے ساتھ داخل کیں۔ صرف اس عمل سے وہ "تمام سلطان الاذکار" بن گیا!!!

شہزادے نے یہ نہیں بیان کیا کہ وہ منظر کتنی دیر بعد اور کس طرح نگاہوں سے روپوش ہوا۔ شاید "تمام سلطان الاذکار" بننے کے بعد اس پر بے خودی طاری رہی ہوگی اور بعد کے واقعات پر توجہ دینے کا ہوش نہ رہا ہوگا۔

عالم ملکوت کا مشاہدہ | عالم ناسوت میں ایسے ملکوتی مناظر دیکھنے کا دعویٰ کرنے والا، بزعم خود عالم ملکوت کے مشاہدے پر بھی قادر تھا۔ ایک دلچسپ دعوے میں

اس کی بصارت اور بصیرت کا عالم دیدنی اور سیاحانِ دشت معرفت و ولایت کے لیے باعث صد رشک ہے۔ اس دعوے کے پس منظر کے بطور پہلے ایک حدیث قدسی کا مفہوم بیان کرتا ہے کہ "ایزد سبحانہ و تعالیٰ نے جس شخص کو دنیا میں بصارت سے محروم رکھا ہے، آخرت میں اس کی آنکھوں کو اپنے نور سے روشن کر کے سب سے پہلے اپنے جمال کے دیدار سے مشرف کرے گا۔" آگے لکھتا ہے کہ اگر کسی شخص کو خدا کی عنایت سے یہ توفیق حاصل ہے کہ وہ اپنے نور ولایت و ہدایت کی ایک توجہ سے ظاہر اور باطن کے بے بصیرتوں کی آنکھیں روشن کر دے تو اس کے نزدیک اس طور پر حصول مطلب کی وقعت ہی کیا؟ اس کی بصیرت کو بصارت کی چنداں حاجت نہیں کیوں کہ جب دل کی آنکھ "بینا" ہو جاتی ہے تو اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ جاتی اور اگر بصیرت کے ساتھ بصارت بھی حاصل ہو تو وہ آنکھ پر عینک کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد لکھتا ہے:

"ایک دن میرے شیخ (ملاشاہ) نے مجھ سے فرمایا کہ آنکھ بند کر اور عالم غیب میں فلاں چیز کا مشاہدہ کر۔ میں نے کہا کہ میں آنکھ بند کیے بغیر اسے دیکھ رہا ہوں۔ انھوں نے میری تحسین و آفرین کی اور فرمایا کہ تو نے ٹھیک کہا۔ دل کی آنکھ صاف اور روشن ہو تو آنکھ بند کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور ظاہری آنکھ بند کیے بغیر عالم ملکوت کے تمام عجائبات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے[1]۔"

شاید ملاشاہ کو اپنے اس صاحب کشف و کرامات مرید کے حال و مقام کی کما حقہٗ خبر نہیں تھی، ورنہ آنکھ بند کرنے کا حکم تو درکنار، اس سے عالم ملکوت کے عجائبات

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۵۸۔

کھلی آنکھوں سے بھی دیکھنے کی فرمایش نہ کرتے۔ وہ خود بھی ملاشاہ کے حکم "چشم را بپوش" کے طفیل میں شاید زندگی میں پہلی بار اس حقیقت سے آشنا ہوا کہ آنکھ بند کرنے میں دراصل قلبی سکون کے حصول اور دفع انتشار کی مصلحت پوشیدہ ہے[1]۔

ایک حیرت انگیز روحانی تجربہ

داراشکوہ کی تصانیف سے اس امر کا وافر ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مرشد کے ارشادات کی تعمیل کے علاوہ اپنے طور پر بھی مختلف عجیب و غریب مسایل پر غور کرتا اور نتائج کے استنباط کی کوشش کرتا تھا۔ یہ دیگر بات ہے کہ اس کے مبینہ نتائج کی نوعیت کیا ہوتی تھی مگر ان کی صحت پر اس کا اصرار رہا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اپنے اخذ کردہ نتائج کی تصدیق اور دفع شکوک کی غرض سے، جیسا کہ اس کی تحریروں سے علم ہوتا ہے، روحانی تجربات بھی کرتا تھا۔ کبھی ملاشاہ کے مریدوں کے دلوں پر تصرف کر کے اور کبھی اپنے تئیں۔ اس نے اپنا ایک روحانی تجربہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"اکثر اس فقیر کے دل میں یہ بات گذرتی تھی کہ مرنے اور روح کے جسم سے جدا ہونے کے بعد روح کو یہی حال، شعور، وجد، ذوق اور شغل حاصل رہے گا یا نہیں؟ ایک بار میں نے دیکھا کہ میری روح جسم سے جدا ہو کر پورے وجد، شغل اور ذوق کے ساتھ ہوا میں ایک قبر کے گرد بگولے کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ تندی اور تیزی سے چکر لگا رہی ہے اور اس حال میں مجھے جو شعور حاصل تھا اسی طرح کا تھا بلکہ بہتر اور زیادہ پُر لذت تھا اور بے انتہا لطافت حاصل کر چکا تھا اور جس شغل میں تھا اس سے زیادہ مشغول، خیالات سے خالی

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۵۸۔

اور بے تعلق ہوگیا تھا۔ اس کے بعد روح آئی اور جسم میں داخل ہوگئی۔ داخل ہونے کے بعد اس دلی اطمینان اور ذوق کے آثار مجھ پر ظاہر تھے لیکن اس درجے کے نہیں۔ معلوم ہوا کہ اس حال کو اس حال سے کوئی نسبت نہیں اور اولیا کے لیے موت کے بعد ترقی ہے اور کیوں نہ ہو کہ حق تعالیٰ ان کے حق میں فرماتا ہے: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ[1]۔ نہ کہو ان لوگوں کو مردہ جو فنا ہوگئے ہیں وحدت حق میں، بلکہ وہ ابد تک کے لیے زندہ ہیں لیکن تم نہیں جانتے اے لوگو! جو بقائے حق اور وجود مطلق میں باقی نہیں ہوئے ہو۔[2]

ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے؟

داراشکوہ کے اس روحانی تجربے کا ماحصل، اس کا اخذ کردہ نتیجہ۔ "اولیا را بعد از ممات ترقی است۔" سے عبارت ہے جو اس کے ادعائے ولایت پر دلالت کرتا ہے۔ منقولہ بالا بیان میں اس نے آیت کریمہ کی جو تاویل کی ہے وہ بھی غور طلب ہے۔ یہ آیت ان شہیدوں کی شان میں نازل ہوئی ہے جنھوں نے کفر و باطل کے خلاف جنگ کی اور اپنے خون سے دوحۂ اسلام کی آبیاری کی۔ اس کا اطلاق "کشتگان خنجر تسلیم" پر کیا جانا کہاں تک مناسب ہے۔ اس حقیقت سے کسی کو مجال انکار نہیں ہوسکتی کہ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کو جس اسلام کی دعوت دی تھی اس میں خانقاہی تصوف کا تصور نہیں تھا۔ وہ دور کفر و ایمان کی باہمی آویزش اور کفار مکہ کے ساتھ مسلمانوں کی جنگوں کا دور تھا۔ ان محاربات میں

[1] نہ کہو ان لوگوں کو جو قتل کیے جاتے ہیں اللہ کی راہ میں کہ مردہ ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم ادراک نہیں کر سکتے۔ (قرآن مجید ۲/۱۵۴) [2] سکینۃ الاولیا: ص ۹۱۔

مسلمان شہید ہو رہے تھے۔ لہٰذا زیر تبصرہ آیت کی تفسیر انہی حالات کی روشنی میں کی جانی چاہیے۔

عبادت یعنی معرفت

داراشکوہ کی تحریروں میں قرآنی آیات کی عارفانہ تاویلات کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں۔ ایک مورد پر عبادت کو معرفت کا مترادف قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے: "خلقت انسان برای عرفان است"۔ (انسان کی تخلیق کا مقصد معرفت ہے) پھر آیت: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ[1] نقل کرکے اس پر "ای لیعرفون" کا اضافہ کرتا ہے اور اس کا ترجمہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"نیست ظہور انسان مگر برای عرفان و حقیقت ایمان"[2]	انسان کا وجود عرفان اور حقیقتِ ایمان کے سوا کسی اور مقصد کیلئے نہیں۔

عبادت کو معرفت سے تعبیر کرنے میں دارا اپنے مرشد ملا شاہ کا مقلد ہے۔ انھوں نے ایک دن فرمایا تھا کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ایک دن میں دس ہزار افراد کو "مومن" بنایا تھا اور انھیں "ایمان حقیقی" یعنی عرفان کے درجے تک پہنچایا تھا۔[3] ملا شاہ کو یہ درس ان کے پیر شاہ میاں میر سے حاصل ہوا تھا جن کا (یا جن سے منسوب؟) یہ قول دارا نے نقل کیا ہے:

"در نزد اہل شریعت شخصی بخواندن کلمہ بعد از کفر مومن می گردد، اما نزد یک اہل حقیقت ہیچ چیز	اہل شریعت کے نزدیک کوئی شخص کفر کے بعد کلمہ پڑھنے سے مومن ہوجاتا ہے لیکن اہل حقیقت کے نزدیک

[1] اور نہیں پیدا کیا میں نے جن اور انسان کو سوائے اس کے کہ وہ میری عبادت کریں۔ (قرآن مجید ۵۱/۵۶) [2] سکینۃ الاولیا: ص ۱۷۰ [3] ایضاً ص ۱۷۱۔

علاج غفلت نمی کند[1] کوئی چیز غفلت کا علاج نہیں کرتی۔

"غفلت" ضد ہے "معرفت" کی۔ اس قرینے سے "ایمان حقیقی" کی بھی ضد ہونی چاہیے (جیسے ایمان مجازی ؛ یا کفر حقیقی ؟)[2] دارا شکوہ یہ بھی لکھتا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ایمان حقیقی یعنی معرفت اور توحید ہی کی تبلیغ کے لیے جہاد فرمایا تھا۔[3] اس کا یہ بھی اصرار ہے کہ ہر شخص کا کسی نہ کسی سلسلۂ سلوک سے وابستہ ہونا لازم ہے۔ جس طرح علم ظاہر کی تحصیل معلم کے بغیر نہیں ہو سکتی اسی طرح علم باطن کے لیے شیخ کی ذات ناگزیر ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :

"تحقیق باید دانست کہ ہیچ کس	تحقیق کے ساتھ جاننا چاہیے کہ انبیا
جز انبیا علیہم السلام بیواسطۂ	علیہم السلام کے علاوہ کوئی شخص بے
شیخی خواہ بظاہر و خواہ اویسی،	واسطۂ شیخ، چاہے وہ ظاہری ہو یا
بحق جلّ و علا واصل نمی گردد	اویسی نوعیت کا، حق جلّ و علا سے
و از ضلالت خود بینی خلاص نمی	واصل نہیں ہوتا اور خود بینی کی ضلالت
شود"[4]	سے نجات نہیں پاتا۔

اس بیان کی رو سے وہ تمام کلمہ گو جو کسی سلسلۂ طریقت سے وابستہ نہیں "ایمان حقیقی" سے محروم قرار پاتے ہیں اور شاہ میانمیر کے بقول کلمۂ طیبہ پڑھ کر خدا کی وحدانیت اور رسولؐ کے نبی مرسل ہونے پر ایمان لانے والے بھی اگر کسی شیخ کو واسطہ نہ بنائیں تو غفلت کی وادی کے رہ نورد بنے رہتے ہیں۔

۱؎ سکینۃ الاولیا، ص ۱۰ ۲؎ دارا نے اپنے ایک خط بنام شاہ دلربا میں "اسلام مجازی" ترک اور "کفر حقیقی" اختیار کرنے کی بات تحریر کی ہے (رقعات عالمگیر، ترجمہ سید نجیب اشرف ندوی، ص ۲۲۲) ۳؎ سکینۃ الاولیا، ص ۱۰ ۴؎ ایضاً ص ۔

ایمان کی قسمیں "ایمان حقیقی" کی حقیقت اور دیگر ایمانوں پر (جن کو شاہ میانمیر نے غفلت اور دارا شکوہ نے ضلالت اور خود بینی کا نام دیا ہے) اس کی وجہ امتیاز جان لینے کے بعد دارا کی بیان کردہ ایمان کی تین قسموں۔ ایمان عوام، ایمان خواص اور ایمان اخص الخواص۔ کی تعریفیں ملاحظہ فرمائیں :

(۱) خدا، رسولؐ، فرشتوں، سماوی کتابوں، رسولوں، حیات بعد ممات، بہشت، دوزخ اور خیر و شر کا اللہ کی جانب سے ہونے کا زبان سے اقرار کرنا اور دل سے تصدیق کرنا ایمان عوام ہے۔

(۲) ایمان خواص یہ ہے کہ خدا کی صفات میں سے کوئی صفت دل پر تجلی کرے اور تمام اعضا اس کے تابع ہو جائیں، مثلاً حضرت موسیٰؑ کے دل پر خدا کی ایک صفت متجلی ہوئی تو انھوں نے کہا : تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ[1] یعنی من اول کسانی ام کہ ایمان آوردہ اند"۔ (میں ان لوگوں میں پہلا شخص ہوں جو ایمان لائے ہیں۔)

(۳) ایمان اخص الخواص کی شرط یہ ہے کہ انانیت زائل ہو جائے، تجلی ذات ہستی موہوم کو کمزور کر دے اور وہ زمان و مکان اور قرب و بعد کے امتیازات سے منزہ ہو جائے۔

بادی النظر میں موخر تعریف ایمان اخص الخواص کی وضاحت معلوم ہوتی ہے مگر دارا کا انانیت آمیز لہجہ صاف غمازی کر رہا ہے کہ وہ اپنا شمار اخص الخواص مومنوں میں کرتا تھا۔ اب تک اس کے جتنے دعوے بیان کیے جا چکے ہیں، اس

۱؎ توبہ کرتا ہوں میں تیرے پاس اور میں ایمان لانے والوں میں سب سے پہلا ہوں (قرآن مجید، ۷/۱۴۳)۔

گمان کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ ملا شاہ کی مریدی اب اس کی مجبوری بن گئی تھی کیوں کہ خود اسی کے بقول انبیا علیہم السلام کے علاوہ کوئی شخص "بے واسطۂ شیخ" واصل الی الحق نہیں ہو سکتا، ورنہ اس کی رسائی تو بے واسطہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک تھی۔

رسول اکرمؐ کی روح طیبہ سے ملاقات اور استفسار

بعض عارفانہ مسایل کی وضاحت کے سلسلے میں بعض اوقات ملاشاہ کے ارشادات سے اس کی تشفی نہیں ہو پاتی تھی۔ ایسی صورت حال کے پیش آنے پر اس نے یا تو حضرت غوث الثقلینؒ اور شاہ میاں میر سے کبھی خواب اور کبھی بیداری کے عالم میں رجوع کرنے کا دعویٰ کیا یا حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کے لیے رابطہ قائم کرنے کا ادعا۔ اس نوعیت کا ایک حیرت انگیز "واقعہ" اسی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

"ایک بار مجھ فقیر کو رویت کے مسئلے میں ایک مشکل در پیش آئی تھی اور دل میں شبہ پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے آنحضرت (ملا شاہ) سے عرض کیا۔ انھوں نے جواب دیا۔ ان دو باتوں (؟)[1] میں سے ایک حل ہو گئی۔ دوسری جو جنت میں رویت کے بارے میں تھی اس سے دل کی تسلی نہیں ہوئی۔ مجھے یقین کے ساتھ معلوم تھا کہ میں نے جواب کو نہیں سمجھا ہے اور از روئے ادب اس بارے میں پھر سے سوال نہیں کر سکا...... جب میں ان کی خدمت سے اٹھا اور اس زائل نہ ہونے والے شبہے کو خاطر نشیں کر لیا تھا، میں نے راستے میں سید کائنات، اشرف موجودات

[1] دو باتوں میں سے ایک کی صراحت نہیں کی ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پر فتوح پر توجہ کی اور سرور کائنات کی روح پاک خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مبارک روحوں کے ساتھ مجھ پر ظاہر ہوئی۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شبہے کے بارے میں سوال کیا۔ سید کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ تو اللہ تعالیٰ کو قادر جانتا ہے، وہ جس طرح چاہے گا مومنوں کو اپنا دیدار کرائے گا۔ اس جواب سے اسی وقت میری مشکلیں حل ہو گئیں اور شبہ رفع ہو گیا۔ جب میں دوسری بار ان کی (ملا شاہ کی) خدمت میں پہنچا اور یہ روداد بیان کی تو وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا: یہی بات تھی اور جس نے [illegible] یہ جواب دیا اسی نے مجھ سے بھی کہا۔ یہ جواب لکھنے کے لائق ہے، تم اسے ضرور لکھنا۔"[1]

داراشکوہ کے بیان کردہ اس "واقعے" کے بالاستیعاب جائزے سے بعض بڑے دلچسپ نتائج برآمد ہوتے ہیں جن سے نہ صرف داراشکوہ کی نام نہاد عارفانہ شخصیت پوری طرح بے نقاب ہو جاتی ہے بلکہ اس کے مرشد ملا شاہ کی روحانی اور عرفانی حیثیت بھی مشکوک ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ اوسط درجے کی فہم و فراست رکھنے والا قاری بھی اگر اپنی قوت استدلال کو بروئے کار لائے تو اسے درج ذیل نتائج اخذ کرنے میں چنداں دشواری نہ ہو گی۔

(۱) داراشکوہ کے بعض بیانات سے علم ہوتا ہے کہ ملا شاہ اس کے باطنی کوائف سے باخبر رہتے اور اس کے مافی الضمیر کو پڑھ لیا کرتے تھے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتا ہے:

"ایک روز ...... میرے دل میں یہ بات گزری کہ اس بار جب ان کی خدمت میں پہنچوں گا تو کہوں گا: فقیر آپ کی ہمسائگی میں رہتا ہے اور امیدوار ہے...

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۱۷۵-۶۔

کہ عقبیٰ میں بھی آپ حق ہمسایگی بجا لائیں گے۔ جب ان سے میری ملاقات ہوئی تو بغیر اس کے کہ میں اظہار کرتا.... انھوں نے کہا: اے یار عزیز! میں عقبیٰ میں بھی تیری مدد اور اعانت کروں گا۔[1]

ایک اور مورد پہ لکھتا ہے:

"فقیر کے دل میں یہ بات آئی کہ اولیائے سلف میں سے اکثر کے احوال و مقامات معلوم اور کتابوں میں درج ہیں۔ حضرت آخوند کا حال و مقام میں نہیں سمجھا کہ کیا اور کہاں تک ہے.... حضرت نے فوراً میرے دل کی بات سے باخبر ہو کر فرمایا: فقیروں میں بعض ایسے ہوتے ہیں جن کا رتبہ اور مقام اس درجے پر پہنچا ہوا ہوتا ہے کہ خدائے پاک و برتر نے ان کے بارے میں فرمایا: وہ مجھ سے سنتا ہے اور مجھ سے دیکھتا ہے اور مجھ سے پکڑتا ہے اور مجھ سے چلتا ہے۔"[2]

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملا شاہ ولایت کے اس مرتبہ و مقام پر فائز تھے کہ ان پر بی یسمع و بی یبصر و بی یبطش و بی یمشی کا اطلاق ہوتا تھا۔ ایسے واصل الی الحق عارف کے لیے کسی کے دل کی بات جان لینا بعید از امکان اور تعجب خیز امر نہیں۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ رویت در بہشت" (جنت میں دیدار الٰہی) کے بارے میں دارا کے سوال کا جواب دینے کے بعد وہ اپنے تئیں سمجھ بیٹھے کہ اس کو تشفی ہو گئی اور اس کے دل میں شکوک و شبہات کے پیدا ہونے کا نہیں ہلکا سا شبہ تک نہیں ہوا۔

(۲) رویت کے مسئلے پر ملا شاہ کا علم ناقص تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۱۷۰ [2] ایضاً: ص ۱۷۵۔

داراشکوہ کا جواب دیا اور مسئلے کی وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ یہ بات اس پائے کے مرشد کو زیب نہیں دیتی جس پائے کے عارف (بلکہ ولی) وہ دارا کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔

(۳) روحانی قوت اور باطنی صلاحیت کے اعتبار سے داراشکوہ کو اپنے مرشد پر فوقیت حاصل تھی۔ زیر تبصرہ معاملے میں اس نے، بقول خود، اپنی روحانی قوتوں کو مجتمع کر کے اپنی توجہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک پر مرکوز کی' اور وہ خلفای راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کی ارواح کے ساتھ اس کی مشکل کشائی کو آ موجود ہوئی (اور وہ بھی سر راہ ہے!!!) جب کہ ملا شاہ اپنی دانست میں اپنے اس مرید خاص کو مطمئن کر کے مطمئن ہو بیٹھے۔

(۴) مبینہ واقعے کے بعد جب پہلی بار داراشکوہ نے ملا شاہ سے ملاقات کی اپنی" کارگذاری" بیان کی تو شاہ صاحب نے "سن کر" خوشی کا اظہار کیا۔ وہ شہزادے کو پیش آنے والے اس" واقعے" سے لاعلم تھے ورنہ وہ اسے دیکھتے ہی مسرت کا اظہار فرماتے۔ اپنی لاعلمی کے باوجود داراشکوہ کی" روداد" سننے کے بعد ان کا یہ فرمانا کہ "ہمین بود کسی کہ این جواب بشما گفتہ، بما ہم گفتہ" کیا معنی رکھتا ہے؟ مبینہ واقعے کو درست تسلیم کرتے ہوئے اگر فرض کر لیا جائے کہ اس قابل صد تعظیم و تکریم ہستی صلی اللہ علیہ وسلم نے ملا شاہ سے صرف مسئلے کے حل کا ذکر فرمایا تھا اور داراشکوہ سے اپنی ملاقات کے حال کا اخفا کیا تھا تب بھی انسانی فطرت اور نفسیات سے زیادہ ملا شاہ کی مرید نوازی اور ان کی افتاد طبع کا تقاضا تھا کہ گفتگو میں پہل خود ان کی طرف سے ہوتی اور دارا کی لب کشائی سے پہلے وہ اسے مبارکباد دیتے ہوئے

اپنے بیان کردہ مفہوم کی اصلاح اور وضاحت کر دیتے۔ اس کے ساتھ ہی جس طرح اپنے حصولِ عرفان کا اعلان "بہ بانگ بلند" کیا تھا[1] سید کونین صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی فیض پذیری کا اعلان بھی "بہ بانگ دہل" فرما دیتے۔

(۵) داراشکوہ کو ان کی تاکید اکید کہ "این جواب نوشتنی است، البتہ خواہید نوشت" بھی مصلحت سے خالی نہیں۔ اس بات کے مشتہر ہونے سے کم از کم عوام و خواص پر یہ تو ظاہر ہو گا کہ ملا شاہ سے ملاقات کے لیے ان کے گھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے۔ اور "پنجہ در پنجۂ خدا دارم" کا دعویٰ کرنے والے ملا شاہ کو "پروای مصطفیٰ" نہ سہی مگر مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا شاہ کی پروا تھی۔

اس ناقابل یقین روایت کو داراشکوہ کی ذہنی اپج کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس کی اس افسانہ طرازی میں ملا شاہ بھی شریک ہو گئے۔ وہ شہزادے کو متاثر اور اپنے بس میں کرنے کے ہر ممکنہ حربے کو آزما رہے تھے کیوں کہ وہ اس سے اپنے مسلک کی ترویج و اشاعت کا کام لینا چاہتے تھے اور اس سے آس لگائے بیٹھے تھے۔ گو انھوں نے سرمد کی طرح صاف اور واضح الفاظ میں اسے سلطنت کی بشارت نہیں دی تھی[2]، مگر وہ اپنے "صاحبقران دل" کے بادشاہ بننے کا خواب ضرور دیکھ رہے تھے۔ خود داراشکوہ بھی احمقوں کی جنت میں جی رہا تھا۔

---

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۱۶۷ [2] صوفی سرمد نے داراشکوہ کو سلطنت کی بشارت دی تھی۔ (ریاض الشعراء، والہ داغستانی: مخطوطہ نمبر ۲۲۳، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ: ورق ۱۸۰ ب) بقول صاحب "نشترِ عشق": سرمد "اکثر عند الاذکار اظہار می نمود کہ آخر رجوع سلطنت بتو خواہد بود" (مخطوطہ نمبر ۲۴۲، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ: ص ۸۶۱)

داراشکوہ نے یہ روایت کب وضع کی ہو گی، وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ ملا شاہ کے حالات کی ترتیب کے دوران حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے اپنی نسبتِ ارادت کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنی عمر اٹھائیس سال تحریر کرتا ہے[1]۔ پھر چند سطروں میں شاہ میانمیر کے الطاف و عواطف اور ایک طویل پیراگراف میں ملا شاہ سے "رخصت ارشاد و اجازتِ ہدایت" پانے اور اس سلسلے میں کلام اللہ سے تفاول کرنے کا حال بیان کرنے کے بعد منقولہ بالا روایت نقل کرتا ہے۔ چونکہ وہ سلخ صفر ۱۰۵۲ھ کو اپنی عمر کے اٹھائیس سال پورے کر چکا تھا اس لیے ظن غالب ہے کہ اسی سال اس نے یہ ناقابل یقین روایت وضع کی ہو گی۔

غیبی آواز کے مسموع ہونے کا ادعا

۱۰۵۵ھ میں وہ صوبہ الٰہ آباد کی نظامت پر فائز ہوا۔ اسکے ساتھ ہی بنارس کے پنڈتوں، جوگیوں اور سنیاسیوں سے اس کا رابطہ قایم ہوا۔ اس نے ان سے سنسکرت زبان سیکھی اور ہندوؤں کے قدیم متون تک براہ راست رسائی حاصل کر لی۔ ویدانتی فلسفے کے مطالعے نے اس کے عقاید و افکار میں زبردست انقلاب برپا کیا مگر اس کے اظہار سے اپنے آپ کو حسنات العارفین کی تالیف (۱۰۶۲ھ - ۱۰۶۵ھ) تک باز رکھا۔ اس دوران وہ بدستور سلاسلِ اولیا میں سلسلۂ قادریہ کی افضلیت کا دم بھرتا رہا۔ اس نے ۸ رجب ۱۰۵۵ھ کو رسالۂ حق نما کی تالیف کا آغاز کیا اور ۱۰۵۶ھ میں اسے تکمیل کو پہنچایا۔ اسکی غایتِ تالیف کے باب میں رقمطراز ہے:

"جمعہ، ۸ رجب المرجب سنہ ایک ہزار پچپن ہجری کی رات میں اس نقیر کے سر میں

---

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۱۷۳۔

آواز دی گئی کہ اولیائے خدا کے سلسلوں میں بہترین قادری سلسلۂ عالی اور طریقت روشن ہے جو سرورِ عالم اور فخرِ بنی آدم ..... محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچا عارفوں کے پیشوا اور واصلوں کے مقتدا ..... سید عبدالقادر جیلانی الحسنی الحسینی رضی اللہ عنہ تک، اور ان سے پہنچا مشائخ عہد میں سب سے بزرگ .... پیر دستگیر شیخ میر قدس اللہ روحہ، تک اور ان سے بے واسطہ منتقل ہوا شاہ محققاں .... حضرت مولانا شاہ سلمہ اللہ البقاء کو، اور ان سے بے واسطہ (منتقل ہوا) راقم حروف (داراشکوہ) کو، اور میں اسی رات اس رسالے کی ترتیم پر مامور ہوا جو ہدایت کی راہ کے طالبوں کو خدا کی راہ دکھانے کے بیان پر محتوی ہے[1]

اس بیان سے مستنبط ہوتا ہے کہ وہ خود کو ملا شاہ کی خلافت کا دعوے دار تصور کرتا تھا اور ارشاد و ہدایت کا منصب بھی ان کے حسب حکم سنبھال لیا تھا۔ رسالۂ حق نما کی ترتیم اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

رسالۂ حق نما کی جامعیت کا تعلّی آمیز اظہار

رسالہ حق نما میں داراشکوہ نے سلوک کے مراحل کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہ چھے فصلوں پر مشتمل ہے۔ (۱) در بیان عالم ناسوت (۲) در بیان عالم ملکوت (۳) در بیان عالم جبروت (۴) در بیان عالم لاہوت (۵) در بیان ہویت رب الارباب (۶) در بیان وحدت وجود۔ ان فصلوں میں سے صرف فصل دوم مفصل ہے باقی فصلیں انتہائی مختصر۔ عالم لاہوت کا بیان صرف سات سطروں میں سمٹ گیا ہے۔ اس رسالے کی عارفانہ افادیت کے بارے میں اس کا دعویٰ ہے:

---

[1] رسالہ حق نما (مشمولہ منتخبات آثار داراشکوہ)، تہران: ص ۳-۲۔

"جو کوئی کسی کامل کی صحبت کا شرف نہ پا سکا ہو اور اسے کامل معرفت حاصل نہ ہوئی ہو، اس رسالے کو پڑھے اور غور و فکر کی نظر سے دیکھے اور شروع سے آخر تک ایک ایک بات کو عمل میں لائے، امید ہے کہ وہ مطلب حاصل کرکے توحید کے پاک مشرب کو کہ انسان کے کمال کی انتہا معرفت ہے، پالے گا اور اس مطلب کو جس سے اسلاف اور اخلاف کی کتابوں کے اوراق بھرے پڑے ہیں اور لوگ اسے سمجھ نہیں سکے، پا جائے گا اور فتوحات، فصوص، سوانح، لوائح، لمعات، لوامع اور تمام کتب تصوف کو سمجھ لے گا۔"[1]

شاہی میں درویشی کا ادعا

رسالۂ حق نما کو رشد و ہدایت کے نقطۂ نظر سے دارا نے غیر معمولی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے لیکن یہ اس کی اولین دو تصنیف سفینۃ الاولیا اور سکینۃ الاولیا کی بہ نسبت زیادہ مقبول نہ ہو سکا۔ حالانکہ دارا نے اس کی عارفانہ افادیت کا انتہائی شد و مد سے اظہار کیا ہے۔ چنانچہ اس رسالے کی تعریف میں خودستائی کی مکمل آمیزش کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اگر کسی مرد خدا کی نظر میں یہ رسالہ آجائے تو وہ داد دے گا کہ اس فقیر کے لیے اللہ تعالیٰ نے کس مرتبے کے دروازے کھولے ہیں اور ایسے لباس[2] کے باوجود فقر و معرفت کے دروازے اس کے لیے کھولے ہیں تاکہ دنیا والوں پر واضح ہو جائے کہ اس کے فضل کو سبب کی حاجت نہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے خواہ کسی لباس میں ہو، اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور یہ وہ دولت نہیں جو ہر کسی پر ظاہر ہو بلکہ اس درگاہ کے اس نیازمند کے لیے مخصوص ہے۔"[3]

---

[1] رسالۂ حق نما (مشمولہ منتخبات آثار داراشکوہ) تہران: ص ۴-۳ [2] مراد شاہانہ لباس [3] رسالۂ حق نما (مشمولہ منتخبات آثار داراشکوہ) ص ۴۔

انجام کار دل کی بات زبان پر آہی گئی۔ اس نے تصنیف و تالیف کا مشغلہ اسی مقصد سے اختیار کیا تھا کہ لوگ اس کے (خود اپنے بیان کردہ) فضل و کمال اور "حقیقت شناسی و خدارسیدگی" کے درجہ و مقام سے واقف ہو جائیں اور اس کی معرفت یابی اور ولایت مآبی کا اعتراف کرلیں۔ منقولہ بالا اقتباس کا فقرہ "آں را کہ میخواہد، در ہر لباسی کہ باشد، بسوی خود میکشد" صاف غمازی کر رہا ہے اس کی اس خواہش کی کہ لوگ اس کی ظاہری ہیئت، وضع قطع اور شاہانہ شان و شوکت نہ دیکھیں بلکہ اسکے باطنی کوائف پر (جن کا اظہار اس کے اعمال و اوصاف سے نہیں، صرف اس کی ناقابل یقین عارفانہ تعلیوں سے ہوتا ہے) نظر رکھیں اور دیکھیں کہ بظاہر شاہزادہ اور شاہجہاں کا ولی عہد ہونے کے باوجود خدا نے اس کے لیے ولایت اور الہیت کے کیا کیا دروازے کھول دیے ہیں۔ یہ بھی ملاحظہ فرمائیں کہ شاہی میں درویشی کا اعزاز ہر کس و ناکس کے لیے نہیں، صرف اس "نیاز مند درگاہ" یعنی شاہزادہ محمد داراشکوہ کے لیے "خاص" ہے۔

اس بیان کی روشنی میں اب شک و شبہ کی گنجایش نہیں رہی کہ داراشاہی میں درویشی کا نہیں بلکہ ریاکارانہ درویشی میں "ہندوستان کی بادشاہت کا خواب" دیکھ رہا تھا۔ بادشاہت اول و آخر اس کا مدعا تھی اور درویشی کا مظاہرہ اس کے حصول کا وسیلہ۔

عربی ناول اور اسلامی موضوعات

از

جناب منظور احمد خاں صاحب

انیسویں صدی عیسوی میں عالم عرب میں جو ذہنی بیداری واقع ہوئی، اسکے نتیجہ میں عربی ادب کو کئی صدیوں کے جمود سے چھٹکارا ملا۔ اس جمود کا سلسلہ تیرہویں صدی عیسوی کے وسط سے شروع ہوتا ہے جب چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو نے خلافت عباسیہ کی بنیادیں ہلا دیں۔ اس نے بغداد کے گوشہ گوشہ میں وحشت و بربریت مچادی تھی، علما کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتارا، عصمتوں کو پامال کیا، یہانتک کہ کتب خانوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ اس طرح عربوں اور عربیت کا شیرازہ چار صدیوں سے زیادہ مدت کیلئے بکھر گیا، علمی و ادبی سرگرمیاں تقریباً ختم ہو کر رہ گئیں۔ عالم عرب اسی کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہوا تھا کہ مغربی استعمار نے اسے اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر سے اپنی شعبدہ بازیوں کا نشانہ بنانا شروع کیا۔

تاہم تاتاری استبداد اور مغربی استعمار کے انداز و طریقہ کار میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ تاتاری تہذیب و ثقافت سے نابلد اور مثبت انداز سے عاری تھے، جبکہ اہل مغرب کے یہاں سلب و ایجاب کے دونوں پہلو پائے جاتے ہیں۔ ایکطرف

تو انھوں نے عربوں کے سیاسی، سماجی اور انفرادی حقوق پر شب خون مارا لیکن دوسری طرف انہیں جدید علوم اور زندگی کے نئے وسائل و ذرایع جیسے صحافت و طباعت وغیرہ سے بھی روشناس کرایا گو اس کا مقصد عربوں کے بجائے خود اپنے سیاسی مفاد کا تحفظ تھا۔ اس لیے جبر و استبداد اور تہذیبی جارحیت پر مبنی مغرب کی یہ حکمت عملی ان کے لیے خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کرسکی، اس کے برعکس یہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ایک نئی جد و جہد اور کشمکش کی باعث بن گئی۔

جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ - ۱۸۹۷ء) وہ پہلے رہنما ہیں جنھوں نے یہ محسوس کیا کہ اسلامی اور عرب ممالک کی پسماندگی اور جمود کی اصل وجہ ایک طرف ان کی سیاسی و اقتصادی زندگی پر مغرب کا بڑھتا ہوا اثر و نفوذ ہے اور دوسری طرف دہریت کا روز افزوں پھیلاؤ۔ افغانی نے اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے مصر کو اپنا مستقر بنایا، جو ان کے نزدیک دوسرے اسلامی و عرب ممالک کی نسبت پختہ شعور کا حامل تھا اس لیے وہاں بیرونی اثر و نفوذ کو ختم کرنے کی دعوت موثر ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ مصری نوجوان بالخصوص ازہر کا پڑھا لکھا طبقہ عرب ممالک کے عام نوجوانوں سے زیادہ بیدار مغز تھا، اس بنا پر اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے وہ زیادہ موزوں تھا جو افغانی نے اسلامی ممالک کی صفیں درست کرنے کے سلسلے میں دیکھا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ بعض ایسے ہونہار نوجوانوں سے متعارف ہوا جنھوں نے بعد میں مصر کی نشأۃ ثانیہ میں بڑھ حصہ لیا۔ ان نوجوانوں میں مصر کے مفتی اعظم شیخ محمد عبدہ (۱۸۴۹ - ۱۹۰۵ء) آزاد مصر کے

قائد اور عظیم رہنما سعد زغلول (۱۸۵۷ - ۱۹۲۷ء) اور جدید مصری فکر کے ایک حامل لطفی السید (۱۸۷۲ - ۱۹۶۳ء) شامل ہیں۔

افغانی نے الحاد و دہریت کو تمام ادیانِ عالم اور خصوصاً اسلام کے لیے ایک عظیم فتنہ قرار دیا۔ انھوں نے اپنی پوری توجہ دہریت کو بے نقاب کرنے میں صرف کی، یہ وہ زمانہ تھا جب پوری مغربی دنیا دہریت کا گیت گا رہی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے فارسی میں "رد دھریین" کے نام سے ایک کتاب رقم کی جسے بعد میں ان کے شاگرد رشید محمد عبدہ نے "رسالۃ الرد علی الدھریین" کے نام سے عربی میں منتقل کیا۔ اس کتاب کا مرکزی موضوع ڈارونیزم کی تردید ہے۔ اسی کے ساتھ ہی اس میں اس کا بھی ذکر ہے کہ اسلام اور صرف اسلام ہی انسانی معاشرے کو امن و سلامتی کی ضمانت فراہم کر کے مادیت کو تباہی و بربادی کی طرف لے جا سکتا ہے، اس میں انھوں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ یونان جیسی عظیم سلطنت کے زوال کا حقیقی سبب مادی نظریہ سے اس کی وابستگی ہے۔

افغانی کے نزدیک حقیقی تہذیب وہ ہے جس کی بنیاد مادی ترقی کے بجائے مذہب اور علم پر رکھی گئی ہو۔ اسی طرح وہ اخوت، عقل اور آزادی پر مشتمل اسلامی معاشرت کو بغض، انانیت اور ظلم و جبر سے عبارت مادی اشتراکیت پر فوقیت دیتے ہیں۔ مصر کے قہوہ خانوں میں دیے گئے ان کے خطبات اور پیرس سے شایع کردہ رسالہ "العروۃ الوثقیٰ" کے پورے عالم اسلام میں دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ تحریک اصلاح جو جزیرہ نمائے عرب اور برصغیر ہند میں سلفیہ کے نام سے مشہور ہوئی اور پھر الاخوان المسلمون

جو اسلامی اقتدار کی بحالی کی داعی ہے، دونوں افغانی کی سعی و جہد کا ثمرہ ہیں۔[1]

بالآخر وہ روشنی جسے لے کر افغانی مصر میں وارد ہوئے ہزاروں مسلمان نوجوانوں کے دلوں کو منور کر گئی۔ ان کے فاضل شاگرد اور ان کی جلاوطنی کے رفیق محمد عبدہ نے اس روشنی کو مزید پھیلانے کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتیں وقف کیں۔ انھوں نے تعلیمی مراکز کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور ازہر جو عالم اسلام کے تعلیمی اداروں میں بہت ممتاز اور بے نظیر ہے کی طرف توجہ کی۔ انھوں نے اصلاح و تجدید اور دین کو اوہام و خرافات سے پاک کرنے اور مسلمانوں کو جدید تمدن سے روشناس کرانے میں بھی کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ استاد اور شاگرد کے درمیان محض طریقہ اور وسیلہ کا اختلاف تھا۔ افغانی کا واحد مقصد عالم اسلام کی وحدت و یکجہتی تھا جبکہ محمد عبدہ کی پوری توجہ دینی اور تعلیمی اصلاح پر مرکوز رہی۔[2]

محمد عبدہ کو ازہر کے طلبہ کے سامنے اپنے خیالات کے اظہار کا بہترین موقع میسر آیا۔ انھوں نے ذہن و فکر کو ہر طرح کی تقلید سے نجات دلانے کا درس دیا، اور اس بات پر بڑا زور دیا کہ مسالک و مذاہب سے بالاتر ہو کر دین کو صحابہؓ اور تابعینؒ کی طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ انھوں نے جدید سائنس سے استفادہ، اسرار کائنات کی تحقیق اور قوانین فطرت کے انکشاف کی مکمل طور دعوت دی، کیونکہ ان کے نزدیک اسلام سائنس کے ثابت شدہ حقائق کی

[1] ملاحظہ ہو جمال الدین افغانی، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانشگاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۷۳ء

[2] جرجی زیدان مشاہیر الشرق، ج ۱، دار المکتبۃ الحیاۃ، بیروت، ص ۳۸۷۔

کسی بھی صورت میں مخالفت نہیں کرتا ہے۔[1]

بدقسمتی سے جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی نشأۃ ثانیہ کی دعوت اس راہ پر قائم نہیں رہ سکی جس پر ان دونوں رہنماؤں نے اسے چلانے کی کوشش کی تھی، کیونکہ مغرب کی تہذیبی جارحیت نے رفتہ رفتہ پورے عالم عرب کو اپنی زد میں لے لیا اس جارحیت کا سب سے اہم مرکز وہ تعلیم گاہیں تھیں جن کی تاسیس سرکار اور کلیسا کی مشینریوں کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی اور جب ان کے فارغ شدہ طلبہ پورے شام، لبنان اور مصر کی صحافت پر قابض ہو گئے تو انھوں نے پڑھے لکھے عرب نوجوان طبقہ میں مغربی تہذیب اور مغربی فلسفۂ زندگی کی پوری پوری تبلیغ کی انہی لوگوں کے ذریعہ ناول پہلی بار عربی ادب میں پذیرائی حاصل کر سکا۔

طلبہ کے ان وفود نے بھی جدید عربی فکر و ادب پر گہرے نقوش چھوڑے جو حکومت مصر کی جانب سے فرانس، اور اٹلی وغیرہ میں حصول تعلیم کے لیے بھیجے گئے۔ گو ان کو بنیادی طور پر سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم حاصل کرنے کے مقصد سے بھیجا گیا تھا لیکن مغربی تہذیب کی پر فریب کشش نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس لیے اپنے ملک میں واپس آکر وہ مغربی افکار و ادبیات کو اپنی زبان میں منتقل کرنے لگے۔[2]

[1] شوقی ضیف، 'الادب العربی المعاصر فی مصر' دار المعارف' قاہرہ، ۱۹۷۹ء، ص ۲۲۲

[2] HAMDI SAKUT, THE EGYPTIAN NOVEL & ITS MAIN TRENDS, DAR AL-MA'ARIF, CAIRO, 1971, PP. 2, 3.

یہیں سے محمد عبدہ کی حریت پر مبنی اسلامی فکر اور مغربی افکار کے طلسم میں گرفتار لطفی السید اور قاسم امین (۱۸۶۵ - ۱۹۰۸ء) کے مادی اور سیکولر نظریات ایک دوسرے سے مخلوط ہونے لگتے ہیں۔ موخر الذکر لوگوں نے صحافت اور تعلیم کو مغربی رنگ میں رنگنے اور اسلامی اقدار کو کمزور کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ نامور مصری محقق و ناقد انور الجندی کی رائے میں یہی لوگ قدیم مصری یونیورسٹی میں مستشرقین کا تقرر کرنے اور پھر ازہر اور اہلِ ازہر پر حملے کر کے مغربی تہذیب اور بالخصوص فرانسیسی تہذیب کی بالادستی کی راہ ہموار کرنے کے ذمہ دار ہیں[1] قاسم امین پردہ، تعدد ازدواج اور طلاق پر پے در پے اعتراضات کی وجہ سے بدنام ہیں۔ انہیں آزادیٔ نسواں کا علمبردار بھی سمجھا جاتا ہے اور ان کے نزدیک اس آزادی کی پہلی سیڑھی مخلوط تعلیم ہے[2]

مغربی تہذیب کی جارحیت نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہونہار مسلم طلبہ کے اذہان کو مسموم کر کے اس نے انہیں اسلامی اقدار کا دشمن بنا دیا چنانچہ پہلے جامعہ مصریہ نے طلبہ کی ذہنی صفائی (BRAIN - WASH) کا کام انجام دیا، اور بعد میں اسی مقصد کے لیے یورپ میں مخصوص طرز کے ادارے قائم کیے گئے۔ جدید عربی ادب کی بلند پایہ شخصیت طٰہٰ حسین اسی سازش کا شکار ہو کر اسکے روحِ رواں بن گئے تھے[3] طٰہٰ حسین نے ۱۹۱۹ء میں فرانس سے واپسی پر صحافت،

---

[1] انور الجندی، محاکمۃ فکر طٰہٰ حسین، دار الاعتصام، ۱۹۸۴ء، ص ۸۰-۷۵ P.K.

[2] HITTI, HISTORY OF ARABS, MICMILAN & CO, LONDON, 1953 P. 755.

[3] انور الجندی، ص ۸۔

تعلیم اور ثقافت پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ ان تینوں میدانوں میں انھوں نے ڈیکارٹ کے فلسفۂ شک پر عمل پیرا ہو کر اسلامی تہذیب و ثقافت سے متعلق لوگوں کے اذہان میں طرح طرح کے شکوک پیدا کیے۔

دوسری جانب بیسویں صدی کے نصف اول میں رونما ہونے والے تغیرات نے ادبا و شعراء کی توجہ قوم و ملت کے مسائل سے ہٹا کر علاقائی مسائل کی طرف پھیر دیا۔ ان مسائل میں بلادِ عربیہ کی عرب لیگ کی آزادی اور تفرقہ فاقہ کے خلاف مغربی افکار و نظریات کا سہارا لے کر جنگ شامل ہے۔ یہی وہ تحدیات تھے جن کا سامنا اسلامی فکر کو عصرِ جدید میں عالم عرب میں اس وقت کرنا پڑا جبکہ عربی ناول بلکہ پورا جدید عربی ادب ابھی ارتقائی مراحل طے کر رہا تھا۔

عصرِ جدید کے عربی و اسلامی فکر کے اس پس منظر سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربی ناول میں اسلامی اثرات نہ ہونے کے برابر ہیں تاہم بعض ناول نگاروں نے اسلامی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ چنانچہ طٰہٰ حسین نے ازہر کے علماء کے غیظ و غضب کو کم کرنے اور عام لوگوں کے ذہنوں سے خود مختلف مباحث میں پھیلائے ہوئے اپنے شکوک کے ازالہ کے لیے اسلامی موضوعات کو ناول کے سانچے میں پیش کیا۔ اسی طرح علی احمد باکثیر نے ناول کے پیرایہ میں کبھی اسلام اور مادیت کا محاکمہ کیا اور کبھی اسلام کے تصورِ جہاد کو قاری کے سامنے پیش کیا[1]

---

[1] ان دونوں کے علاوہ کئی اور ناول نگاروں نے بھی اسلامی موضوعات پر قلم اٹھایا جن میں کامل گیلانی پیش پیش ہیں مگر بدقسمتی سے ہمیں ان کی تحریروں تک بلاواسطہ یا بالواسطہ کوئی رسائی حاصل نہیں ہو سکی۔

اس طرح عربی ناول نے جن اسلامی موضوعات کا احاطہ کیا وہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) سیرت نبویؐ (۲) سیرت صحابہؓ (۳) جہاد اور (۴) کمیونزم اور اسلام کے درمیان کشمکش۔

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

یہ موضوع آنحضورؐ کی حیات طیبہ سے لے کر آج تک برابر عرب ادبا و شعرا کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اختراعی ذہن کے مالک طٰہ حسین نے اسے کہانی کے سانچے میں ڈھالا اور "علی ھامش السیرۃ" نام کی ایک کتاب تالیف کی۔ اپنے مقصد اور طریقۂ کار کی وضاحت کرتے ہوئے طٰہ حسین کتاب کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں :

> " میں نے اس کتاب میں نبی کریمؐ کے ظہور سے قبل عہد کے کچھ خرافات بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر میں نے آپؐ کی ولادت اور بچپن کے حالات بیان کیے ہیں اور میں اس سلسلہ کو جیل لومیتر سے مستعار لیے گئے عنوان یعنی "علی ھامش السیرۃ" کے تحت شایع کر رہا ہوں، جس کا مفہوم ہے متعلقات سیرت نبویؐ۔ یہ کتاب محض تخیل کی اختراع ہے ... میں نے اس میں چند دیو مالائی قصوں کی ماہیت پر اعتماد کرکے واقعات بیان کرنے اور (ناول کا) ڈھانچہ وضع کرنے میں پوری آزادی سے کام لیا ہے تاہم یہ ڈھانچہ نئے ذہنوں کا ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ قدیم تصورات کا محافظ بھی ہے"۔[1]

اس طرح طٰہ حسین وہ پہلے ادیب ٹھہرے جنھیں عربی ادب میں خرافات کا داعی ہونے کا "شرف" حاصل ہوا۔ ان کے خیال میں لوگ خرافات کے مطالعہ میں

[1] ملاحظہ ہو: انور الجندی، ص ۱۸۴۔

شدید میلان رکھتے ہیں۔ ان کا یہ استدلال اس امر پر مبنی ہے کہ یونان، روم اور مغرب کا ادب خرافات سے بھرا ہوا ہے۔ طٰہ حسین کو شکایت ہے کہ عربوں میں خرافات کی جانب میلان تقریباً مفقود ہے، وہ سیرت کو مشہور یونانی رزمیہ "ایلیڈ" کے ہم پلہ قرار دے کر ادبا کو اس سے دلچسپی لینے کی تلقین کرتے ہیں۔

طٰہ حسین نے سیرت نبویؐ کو دیو مالائی قصوں اور خرافات جیسا قرار دے کر ناروا جسارت کی ہے دراصل سیرت نبویؐ پیغام الٰہی کا غیر منقسم حصہ ہے، جس کا مطالعہ دل لگی و تفریح کے بجائے ایمان کے اضافہ و ازدیاد کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس امر میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ اسلام ہر طرح کے خرافات کا سرے سے مخالف ہے، کیونکہ یہ باطل اوہام اور وسوسوں کی پیداوار ہیں، جبکہ اسلام کی بنیاد سراسر علم، یقین اور معرفت پر ہے۔ طٰہ حسین کے ناپاک عزائم اور منصوبوں کو خاک میں ملا دینے میں خود ان کے ہم خیال رفقا کا بڑا حصہ ہے، اس ضمن میں محمد حسین ہیکل کا نام سر فہرست ہے، انھوں نے ان کی مذکورہ بالا کتاب پر سخت اعتراضات کیے۔ وہ فرماتے ہیں کہ طٰہ حسین عقل و منطق کے ذریعہ اپنی بات منوانے میں ناکام ہونے کے بعد دیو مالائی قصوں پر اتر آئے ہیں۔ دوسرے محققین و ناقدین نے اس کتاب کو ان کی ممنوعہ کتاب "فی الشعر الجاھلی" کا ضمیمہ بتایا ہے۔[1] ان ناقدین کی نظر میں اس کتاب کو "علی ھامش السیرۃ" کہنے کے بجائے "علی ھامش الشعر الجاھلی" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ انور الجندی کا یہ خیال بالکل بجا ہے کہ اسلام سے متعلق طٰہ حسین کی دوسری کتابوں کی طرح

[1] انور الجندی، ص ۱۹۱۔

"علیٰ ھامش السیرة" بھی مغربی طرز فکر کی تقلید کا ثمرہ ہے، اس کا مقصد مسلمانوں کو اپنی اصل واساس سے بیگانہ کرنا ہے، یہ یونان کی مشرکانہ فکر اور یہودی خرافات سے مغلوبیت کی آئینہ دار ہے۔

سیرت صحابہؓ اس موضوع پر طہٰ حسین نے "الوعد الحق" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی۔ جس کا مقصد بیکس وبے مددگار مسلمانوں کے اسلام لانے اور انکی زندگی کے مخفی واقعات وحالات کی عکاسی ہے، تاہم یاسرؓ بن عامر، انکی اہلیہ سمیہؓ اور ان کے فرزند عمار بنؓ یاسر کا ذکر پوری کتاب پر چھایا ہوا ہے۔ مؤلف نے اسلام کی نسبت سے ان نفوس قدسیہ کے جوش وولولہ خیز واقعات بڑی صراحت سے پیش کیے ہیں[1]۔

جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں لوگوں کے سامنے اللہ کا پیغام پیش کیا تو ان پاکیزہ نفوس نے کلمۂ حق پر لبیک کہنے میں توقف وتامل سے کام نہیں لیا لیکن قریش کے سربرآوردہ لوگوں نے ان کی اس حق پسندی کو اپنے خلاف علانیہ بغاوت سمجھا اور ان کے درپے آزار ہوگئے، انھوں نے شمع رسالت کے پروانوں پر طرح طرح کے مصائب ڈھائے مگر اس کے باوجود قریش کے سرداروں کو ناکامی ہوئی اور ان کی ناقابل بیان اذیتیں صدق وصفا کی راہ پر چلنے والوں کا قدم ڈگمگا نہ سکیں بلکہ اس سے ان کا ایمان مزید راسخ اور عقیدہ پختہ ہوتا گیا

ع بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

دراصل طہٰ حسین کی یہ کتاب مندرجہ ذیل آیتوں کی تکمیل تفسیر ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو: طہٰ حسین، الوعد الحق، دار المعارف، قاہرہ، ۱۹۸۱ء، ص ۴۲، ۴۳۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا
مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ، وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ
دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى
لَهُمْ، وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ
بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا،
يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ
بِيْ شَيْئًا، وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ
ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ

(نور : ۵۵)

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے اور ان کے لیے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے اور ان کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا، بس وہ میری بندگی کریں، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔

وَنُرِيْدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ
اسْتُضْعِفُوْا فِي الْأَرْضِ
وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ
الْوَارِثِيْنَ. وَنُمَكِّنَ لَهُمْ
فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ
وَهَامَانَ وَجُنُوْدَهُمَا

اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ مہربانی کریں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے اور انہیں پیشوا بنا دیں اور انہی کو وارث بنائیں اور زمین میں ان کو اقتدار بخشیں، ان سے فرعون وہامان اور ان کے

مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ لشکروں کو وہی کچھ دکھلا دیں جس کا

(القصص: ۵-۶) انہیں ڈر تھا۔

مولف نے ان آیات کو متعدد بار نقل کیا ہے اور اول الذکر سے کتاب کی ابتدا اور موخر الذکر سے اس کا اختتام کیا ہے۔

لیکن یہ کتاب بھی مصنف کے مخصوص طرز فکر کی آئینہ دار ہے اور اس میں انھوں نے صحابہؓ کرام کے اوصاف حمیدہ اور مومنانہ خصائل کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً وہ حضرت خبابؓ بن الارت کے بارے میں یہ خامہ فرسائی کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عمرؓ کے سامنے اپنے تقویٰ کا اظہار کر کے اپنے دو رفقاء، حضرت بلالؓ اور حضرت عمار بن یاسرؓ پر اپنا تفوق ظاہر کیا، تدوین قرآن کے ضمن میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور حضرت عثمان بنؓ عفان کے اختلافات کا ذکر کیا ہے جیسا کہ معلوم ہے حضرت عثمانؓ نے قرآن پاک کی جمع و تدوین کے لیے حفاظ صحابہؓ کی ایک کمیٹی تشکیل کی تھی جس کی صدارت حضرت زید بنؓ ثابت کو سپرد کی تھی۔ یہ کام انجام پا گیا تو خلیفہ نے پہلے سے مرتب تمام غیر سرکاری نسخوں کی تحریق کا حکم جاری کیا مگر امام ابو داؤد نے عبداللہ بنؓ مسعود کی یہ روایت نقل کی ہے کہ وہ اکثر کہا کرتے تھے "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سترہ سورتیں سیکھیں اور زید بنؓ ثابت بچے تھے"۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ صدارت کے لیے حضرت ابن مسعودؓ اپنے کو حضرت زید بنؓ ثابت کے مقابلہ میں زیادہ اہل سمجھتے تھے۔ لیکن جب حضرت زیدؓ کو خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتب وحی مقرر فرمایا تھا تو بھلا ان کی اہلیت پر کسی کو شک کرنے کی گنجائش ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے[۱]۔ اور حضرت ابن مسعودؓ خلیفہ کے حکم کو

[۱] مقالات شبلی جلد ۱ ص ۱۶ و ۱۷۔

کیسے نظر انداز کر دیتے ان کے لیے تنقید کرنے کا جواز کہاں باقی تھا جب کہ خلیفہ کے فیصلے کو پوری شوریٰ کی تائید حاصل تھی۔

مصنف نے بیت المال کے ہیرے کے سلسلے میں حضرت عمار بنؓ یاسر اور حضرت عثمان بنؓ عفان کے اختلافات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ جب حضرت عثمانؓ کے اہل خانہ میں سے کسی نے اس ہیرے کو زیور بنا کر پہنا اور یہ بات پورے صحابہؓ میں مشتہر ہو گئی تو اکثر نے اسکے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ جب یہ بات خلیفہ کو معلوم ہوئی تو انھوں نے جمعہ کو منبر سے یہ اعلان کیا کہ انھوں نے جو کچھ بیت المال سے لیا ہے وہ اپنی ضرورت کے لیے لیا ہے آیندہ بھی کچھ لوگوں کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر ایسا کرتے رہیں گے۔ اس اعلان پر جب حضرت علیؓ اور حضرت عمارؓ نے انہیں للکارا تو وہ حضرت علیؓ کی بات پر خاموش ہوئے لیکن حضرت عمارؓ کو گالی دی۔

حضرت عثمانؓ اور ان کے بعض معاصرین خصوصاً عمار بنؓ یاسر کے درمیان بعض اختلافات ضرور تھے، لیکن مصنف کی لغو بیانی اور حضرت عثمانؓ پر ان کی صریح تہمت سے کوئی صاحب علم اتفاق نہیں کرے گا، اس طرح کی نامناسب باتیں تو عام افراد کے بھی شایان شان نہیں ہیں چہ جائیکہ صحابۂ کرامؓ اور ایک خلیفہ برحق کی جانب ان کو منسوب کیا جائے جن کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "کامل الحیاء والایمان" کے مبارک لقب سے نوازا ہے۔

کتاب کا یہ آخری حصہ جس میں مشاجرات صحابہ کا تذکرہ ہے نہایت

قابل اعتراض ہے اس کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ طہ حسین مذکورہ بالا قرآنی آیات کا مذاق اڑا رہے ہیں، یہ حصہ مختلف فیہ مسائل پر مشتمل ہونے کے علاوہ ناول کی تکنیک سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔ کتاب کے نام "الوعد الحق" کی رعایت سے مجبور و مظلوم مسلمانوں کی قبل از اسلام کی زندگی سے لے کر امامت و سیادت پر ان کے فائز ہونے تک کے دور کو موضوع بحث بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن اختلافات اور اہانت صحابہ کے تذکرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف خلافت و سیادت کے وعدہ پر مشتمل آیات کریمہ کو کھلے عام جھٹلانا چاہتا ہے' یا پھر وہ قاری کی توجہ اس کی طرف موڑ دینا چاہتا ہے کہ ان صحابہ کو حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں جس طرح ایذا رسانی اور بے عزتی کا سامنا کرنا پڑا اسی طرح کی ایذا وہ مشرکین مکہ کے ہاتھوں عہد جاہلیت میں بھی جھیل چکے تھے۔[1]

جہاد

اس موضوع کو علی احمد باکثیر نے "وا اسلاماہ" نامی ناول میں لیا ہے۔ یہ ناول ہلاکو خاں کے مصر پر تسلط اور سلطان مظفر قطز کی قیادت میں مصریوں کے تاتاری سیلاب کے دفاع کے بیان پر مشتمل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب ہلاکو نے عراق، شام اور ان کے مضافات فتح کرنے کے بعد سلطان مصر کو دھمکیاں بھیجیں تو سلطان نے ان دھمکیوں کی کوئی پروا نہیں کی بلکہ اسکے چار قاصدوں کو موت کے گھاٹ اتار کر ان کے سر قاہرہ کے زویلہ دروازے پر لٹکا دیے اور خود اس سفاک دشمن کے خلاف فیصلہ کن معرکہ کی تیاری میں لگ گیا۔ اس سلسلے میں اس نے مصر کی سرکاری فوج کے ساتھ ساتھ مجاہدین

۱؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: الوعد الحق، ص ۱۵۵-۱۵۹۔

اور عام رضاکاروں کی خدمات سے بھی پورا فائدہ اٹھایا جو سلطان کی دعوتِ جہاد پر لبیک کہہ کر صف بستہ ہوئے تھے۔ اس طرح سرفروشوں کا یہ گروہ ان تاتاری افواج سے جن کی دھاک تمام اقوام عالم کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی، نبرد آزما ہونے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں افواج کا آمنا سامنا مصر کے عینِ جالوت نامی مقام پر ہوا جہاں مصری مسلمانوں نے اس درندہ خصلت قوم کے دانت کھٹے کر کے رکھ دیے۔

یہی واقعات باکثیر کے مذکورہ بالا ناول کی بنیاد فراہم کرتے ہیں، جس کی صراحت اس کے مقدمہ میں بھی موجود ہے۔ لیکن جب آگے چل کر مولف کی پوری توجہ مظفر قطز کی شخصیت کی تصویر کشی پر مرکوز ہوتی ہے تو یہ واقعات ثانوی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس طرح باکثیر پر ناقدین کا یہ قول بالکل صحیح ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے ناول کے روح پرور اور جوش آفرین عنوان کے بجائے اس کے ہیرو کی طرف زیادہ توجہ دی۔ اسی طرح وہ مجاہدین اور رضاکار بھی ان کی بے توجہی کا شکار بن گئے جن کے متعلق بعض تاریخی مآخذ میں بتایا گیا ہے کہ ان کی تعداد سرکاری افواج سے کہیں زیادہ تھی اور یہ کہ انھوں نے اس فتح میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔[1]

کمیونزم اور اسلام کے درمیان کشمکش

علی احمد باکثیر کا مشہور تاریخی ناول "الثائر الاحمر" اس موضوع کا احاطہ کرتا ہے، جس میں وہ واشگاف الفاظ میں اس

۱؎ احمد ابراہیم الہواری، الروایۃ التاریخیۃ فی الادب العربی، دار المعارف، قاہرہ ۱۹۷۹ء، ص ۸۴۔

حقیقت کا اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ کمیونزم کا نظریہ اسلامی نظریہ حیات کے مقابلہ میں ناکام ثابت ہوگیا ہے۔ ایک طرف وہ یہ بات کوفہ میں مزدور طبقہ پر زمینداروں کے ظلم و استبداد کی تصویر کشی کر کے سامنے لاتے ہیں اور دوسری طرف وہ کمیونزم کے غیر فطری اور بالخصوص اسلامی طبیعت سے اس کے متصادم ہونے کو نمایاں کرتے ہیں۔

ناول کا ہیرو مزدور طبقہ کا فرد ہے جو اپنے علاقہ کے زمیندار کے مظالم کا نشانہ ہے زمیندار اسے معمولی اجرت دے کر اس کی جسمانی قوت کا استحصال ہی نہیں کرتا ہے بلکہ وہ اس کی بہن کا بھی اغوا کرتا ہے۔ اس جابرانہ طرز عمل کے احتجاج میں وہ غنڈوں کے ایک گروہ سے جا ملتا ہے' جن کا کام مالدار طبقہ پر ڈاکہ ڈال کر مفلسوں کی جھولی بھرنا ہوتا ہے۔ دریں اثنا وہ کوفہ کے گرد و نواح میں کاشتکاروں اور مزدوروں کے درمیان اسماعیلی فرقہ[1] کے فروغ کی مہم میں بھی حصہ لیتا ہے یہاں تک کہ وہ "بطائح" کا علاقہ اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے۔ تاہم اسے خلیفۂ وقت کے بھائی کے ہاتھوں شکست ہوتی ہے اور وہ مدۃ العمر روپوش ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جب نیا خلیفہ معتضد مصلح و داعیٔ اسلام برسر اقتدار آیا تو وہ ایک طرف سے فقیہ وقت ابوالبقار کی اسلامی تشریع کی کافی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور دوسری طرف اسلامی اصولوں کے نفاذ کا عملی خاکہ تیار کرواتا ہے۔ قدرتی طور پر عام لوگوں کے معاشی حالات

[1] یہ لوگ اسماعیل بن جعفر صادق کی امامت کے قائل ہیں، فاطمی خلیفہ مستنصر کے عہد تک دوسرے اسلامی فرقوں سے ان کا اختلاف اسی حد تک تھا۔

رفتہ رفتہ بہتر ہو جاتے ہیں اور ہیرو اسماعیلی فرقہ کی حمایت سے دستبردار ہو جاتا ہے اور اپنے ساتھیوں کو نئے خلیفہ کی اطاعت کی ترغیب دیتا ہے۔

جدید مصری محقق حمدی سکوت کے مطابق جن اصولوں کی تجویز فقیہ ابوالبقاء نے ناول میں پیش کی، بعد میں مصری معاشرے میں ان کے دور رس اثرات مرتب ہوئے اور مصری حکومت نے ناول کی اشاعت کے چند سال بعد[1] انہیں پوری طرح نافذ کیا۔ ان اصولوں میں مثال کے طور پر ابوالبقار کا یہ قول بھی شامل ہے کہ "حکومت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ زمین کا مالیہ مقرر کرتے وقت اس کی زرخیزی اور حجم کا خیال رکھے اور یہ کہ صاحب زمین سے کسی بھی صورت میں مقرر کردہ مالیہ سے زیادہ رقم کا مطالبہ نہ کرے"۔ یہ قول مصر کی زرعی اصلاح کی ایک دفعہ سے ملتا جلتا ہے جس کا نفاذ ۱۹۵۲ء کے فوجی انقلاب کے بعد عمل میں آیا[2]۔

مذکورہ بالا بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عربی ناول نے اسلامی موضوعات کا اس قدر اہتمام نہیں کیا جس قدر اس نے معاشرتی، رومانی اور دوسرے موضوعات کا اہتمام کیا۔ ہمارے خیال میں عربی ناول میں اسلامی موضوعات کیلئے ایک وسیع میدان کھلا پڑا ہے، کیونکہ اسلام اور مسلمانوں کے درمیان تفریق بالعموم اور عرب مسلمانوں کیلئے بالخصوص۔ جنکا عقیدہ راسخ ترین اور خالص ترین ہے۔ ناممکن ہے۔ چونکہ اسوقت پورا عالم عرب آمریت اور خلفشار کے دور سے گذر رہا ہے اور یہ کہ وہ اپنے ملی تشخص سے یکسر بیگانہ ہے ان حالات میں ادب اور بالخصوص ناول اسلامی افکار کی تبلیغ کا ایک موثر ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔

[1] یہ ناول ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا [2] HAMDI SAKUT, PP. 68. 69.

اخبار علمیہ

ادھر چند برسوں میں دنیا بھر میں علوم اسلامیہ کے عمدہ اور قابل قدر رسالوں اور مجلوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے، کوالالمپور ملیشیا کے ادارہ بیرٹیا پبلشنگ کی جانب سے شایع ہونے والا سہ ماہی مجلہ پیریوڈیکا اسلامکا Periodica Islamica اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، ڈاکٹر منور احمد انیس اور عبدالرحیم بن اسمٰعیل کی زیر ادارت اس مجلہ کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں مذہب، تاریخ، تہذیب، تمدن، معاشرت، اجتماعیات اور سیاسیات کے تعلق سے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق دنیا کے مختلف ملکوں کے اہم رسائل کے مضامین و مقالات کی تلخیص سلیقہ سے پیش کی جاتی ہے، رسالہ کے آخر میں مضمون نگار اور اشاعتی اداروں کا مکمل اشاریہ بھی درج کیا جاتا ہے، پہلے شمارہ میں لاطینی حروف میں طبع ۱۱۴ رسالوں کے مضامین کی تلخیص و اشاریہ موجود ہے، ان کو حالات حاضرہ، مطالعہ اسلامی، فلسفہ، تاریخ، سائنس، ٹکنولوجی، معاشیات، نسائیات، آرٹ، تعمیر فلسطین، شرق اوسط اور جنوب ایشیا، افریقہ، مسلم اقلیتیں، بین الاقوامی امور اور بین المذاہب مطالعے کے عنوانوں کے تحت درج کیا گیا ہے، مزید خوشی اس کی ہے کہ ادارہ نے عربی اور اردو رسائل کی تلخیص شایع کرنے کا بھی منصوبہ بنایا ہے۔

ادارہ مقتدرہ قومی زبان پاکستان کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان انگریزی اردو لغت کی تالیف کا ذکر پہلے بھی کیا جاچکا ہے، اب ادارہ کے ماہانہ ترجمان

اخبار اردو کے تازہ شمارہ سے یہ خوش اثر خبر ملی کہ یہ لغت طبع ہوگیا ہے، گذشتہ چار برسوں سے زیر تالیف اس لغت میں تمام علوم و فنون کے الفاظ و اصطلاحات پر مشتمل تقریباً دو لاکھ اندراجات ہیں، برطانوی انگریزی کے علاوہ امریکی انگریزی کے املا، معانی اور روزمرہ محاورات کو یکجا کرنے کی جدت بھی کی گئی ہے، ایک لفظ کے ایسے تمام معانی جمع کردیے گئے ہیں جو مختلف مستند کتابوں میں استعمال کیے گئے ہیں، اسی طرح معانی کے ساتھ مترادفات بھی زیادہ سے زیادہ دیے گئے ہیں۔ لفظ میں موجود بنیادی تصور کی نشاندہی بھی کردی گئی ہے، لغت سے استفادہ میں سہولت کا خاص خیال رکھا گیا ہے مثلاً ایک لفظ کے معنی کیمیا اور طبعیات میں مختلف ہیں تو ان دونوں کے زیر عنوان الگ الگ معنی دیدیے گئے ہیں، کمپیوٹر کی کتابت میں بڑی تقطیع پر ۲۴۷۲ صفحات پر مشتمل اردو زبان میں اب تک کا یہ سب سے ضخیم لغت ہے پاکستانی سکہ میں اس کی قیمت ۹۶۰ روپیے ہے۔

گذشتہ دنوں رباط مراکش میں منعقدہ اسلامی دستکاری اور صنعت و حرفت کے متعلق ایک بین الاقوامی سمینار کی خبر ملی تھی، اب معلوم ہوا کہ سمینار کا خاص مقصد مسلم ممالک میں روایتی صنعتوں اور دستکاریوں کے بقاء تحفظ اور جدید طرز پر ان کی ترقی و فروغ پر غور و خوض کرنا تھا، یونیسکو، الیسکو، ورلڈ کرافٹ کاونسل کے نمائندوں اور بعض ممتاز بین الاقوامی اداروں کے ماہرین کے علاوہ انڈونیشیا، ایران، اردن، بحرین، برونی، بنگلہ دیش، پاکستان، ترکی، تیونس، دارالسلام، سعودی عربیہ، شام، فلسطین، گیانا، لبنان، ملیشیا، مراکش، مصر، نائیجریا اور یمن کے مندوبین کی جانب سے ۴۴ مقالات پیش کیے گئے۔ کلیدی مقالہ

Livingcrafts in Islam, Past, Present And Future
تھا، اس کے علاوہ فن کے فروغ میں تکنیکی تعاون اور ٹکنولوجی کی منتقلی، معیاری صنعتی پیداوار کے مسائل، دستکاری کی ترقی اور معاشی و مالی پہلو اور روایتی حرفتوں کا تحفظ وغیرہ مقالے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سیمنار کی قراردادوں میں اولیتؐ صنعتوں کی تعلیم و تربیت کو دی گئی اور قدیم و نفیس قدیم اسلامی مصنوعات کو مزید آب و تاب کے ساتھ پیش کرنے پر بھی توجہ دی گئی، مختلف ممالک کے ماہر دستکاروں کے تبادلۂ خیال اور تکنیکی تعاون اور مالی دشواریوں کے حل کے علاوہ اشتہار کے جدید ترین ذرائع نمائش اور میوزیم کے انعقاد پر بھی بحث ہوئی، اس موقع پر اسلامی صنعت و حرفت کے شاہکار نمونوں کی نمائش ہوئی اس میں ترکی سے انڈونیشیا تک کے ماہرین کی حیرت انگیز دستکاریوں کے عجیب نمونے دیکھنے میں آئے، سفال گری سے لے کر کپڑے، ریشم، قالین، چمڑے اور شیشے کے نمونوں نے نمائش کو ایک طلسم خانہ بنا دیا، بنگلہ دیش کے وفد نے ریشم کے کپڑے پر تاج محل کا زرنگار نقش پیش کیا جو نگاہ و دل کے لیے خاص کشش کا سبب بنا رہا۔ اسلامی فن صنعت پر چند تازہ مطبوعات بھی پیش کی گئیں۔

گذشتہ دنوں استنبول کی ایک دلچسپ نمائش میں عثمانی عہد کے آلات اوزان اور پیمائش کے آلات و ظروف کو پیش کیا گیا، عجیب عجیب برتن، چمچے، طویل ترین بھی اور بہت مختصر بھی، جوہریوں کے آلات و ظروف کے علاوہ نظام، شماری سے قبل، وزن کرنے کے عجیب و غریب آلات نے

کیل و وزن میں عثمانیوں کے انصاف پر شہادت فراہم کر دی، نہایت پیچیدہ اور انتہائی نازک اور دقیق آلات اور کانسے اور پیتل کے وزن کرنے اور مہر کے کام میں آنے والے درہم لائق دید تھے، ان اوزان اور پیمانوں کو اسطرح سلیقہ سے پیش کیا گیا تھا کہ عہد بعہد سلیم اول سے عبدالحمید ثانی تک انکے ارتقا کا بھی اندازہ ہو جائے، ان ظروف کے طریقۂ استعمال کی تفصیلات بھی فراہم کی گئیں، نظام اعشاری سے ما قبل غلہ اور اجناس کے تبادلہ کی صورت میں جو طریقہ رائج تھا اس کو بھی واضح کیا گیا۔

"نو صدیوں کے اسلامی ہتھیاروں کے فوجی ورثہ پر ایک نظر" کے زیر عنوان، ریاض، سعودی عربیہ میں ایک دلچسپ نمائش بھی لائق ذکر ہے، اس میں آٹھویں صدی سے تیرہویں صدی تک مسلمان عسکریوں کے اسلحہ جات کو پیش کیا گیا ہے، تقریباً ۴۵۰ قسم کے ان ہتھیاروں کو دیکھ کر مسلمان فوجوں کی فتح و ظفر مندی کی پارینہ داستان پھر تازہ ہو گئی، کاش اس نمائش میں ٹوٹے ہوئے نیزوں اور خم شدہ تلواروں اور ..... عجیب و غریب اور نادر و منفرد ساخت کے ان ہتھیاروں کے پس منظر جوش و ولولہ کے نقوش بھی دیکھے جاتے، آرٹ، مصوری اور دوسرے فنون جمیلہ کی قدردانی کے اس دور میں اس قسم کی با مقصد نمائشوں کا آغاز تو ہوا۔

(ع۔ ص)

معارف کی ڈاک

مکتوب پاکستان

مکرمی و محترمی مولانا اصلاحی صاحب! زید مجدہ   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی۔ رفقائے دارالمصنفین سے بذریعہ "معارف" ملاقات تو ہمیشہ رہتی تھی البتہ فروری ۹۲ء میں دارالمصنفین کی زیارت پہلی دفعہ نصیب ہوئی تھی اور رات بھر قیام بھی رہا تھا۔ اس وقت آپ حضرات نے احقر کو جس محبت و مودت سے نوازا تھا وہ اب تک یاد ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ یاد رہے گا بلکہ میرے لیے تو باعث افتخار ہے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ

اس مرتبہ تو صرف شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری حفظہ اللہ کی عیادت مقصود تھی لیکن اعظم گڑھ آکر دارالمصنفین نہ آنا تو ناممکن ہے کیونکہ بدو شعور ہی سے اسکا تذکرہ حسنہ حضرت والد صاحب مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی علیہ الرحمہ سے سنتے رہے اور حقیقت ہے کہ اس احاطہ میں آکر ایک قلبی سکون اور ایک گونہ احساسِ اپنائیت ہوتا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ اس علمی ادارہ کو سلامت رکھے اور تادیر اس شجرۂ طیبہ کا سایہ مسلمانوں پر قائم رکھے نیز اسکے بانی اور انکے متوسلین و تلامذہ کی کوششوں کو قبول فرماکر سرمایۂ آخرت بنائے۔ آمین ثم آمین۔

والسلام مع الاکرام

دعا جو }
دعا گو } احمد شاکر

۲۵ فروری ۹۲ء

مکتوب راجستھان

اوونی کلاں۔ راجستھان ۲۲ مارچ ۱۹۹۲ء

مکرم و محترم مولانا اصلاحی صاحب   السلام علیکم

امید ہے کہ مزاج سامی بعافیت ہوں گے۔ راجگان کے ذریعہ انہدام مساجد کا معاملہ زیادہ ملتا نہیں۔ پھر میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی راجہ کی حیثیت ایک بڑے زمیندار سے زیادہ نہیں تھی اس لیے انہیں مسلم فرمانرواؤں کے مقابلے میں نہیں لایا جا سکتا ہے البتہ ہرش وردھن تک کے سمراٹوں کو مقابلہ میں لایا تو جا سکتا ہے لیکن اس زمانہ تک مساجد یہاں نہ تھیں ان تمام سمراٹوں نے دیگر مذاہب کے معابد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی اس کے ثبوت بہت ہیں جو شبلی اکیڈمی کے لٹریچر میں بھی مع اسناد موجود ہیں۔ ۱۸۶۶ء میں مہاراجہ الور نے شہر الور کی تمام مساجد کو منہدم کر دیا تھا۔ جامع مسجد کی جگہ آج Hope circle کے نام سے شاندار چوراہہ بنا دیا گیا ہے۔ اب بمشکل تمام میو حضرات نے ایک مسجد، مدرسہ اور مسلم ہوسٹل کی تعمیر کی ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ جامع مسجد بھرتپور جسے فن تعمیر کے اعتبار سے چھوٹی شاہجہانی جامع مسجد کہہ سکتے ہیں بدستور موجود ہے۔ سکھ مظالم آپ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ رنجیت دیو والی جموں متوفی ۱۱۹۶ھ کے عہد میں مسلمانوں پر سخت مظالم ڈھائے گئے حتیٰ کہ مسلمانوں کو اذان دینے تک کی اجازت نہ تھی چنانچہ دل محمد دلشاد پسروری مرثیہ خواں ہے:

بسکہ منعت دریں شہر اذانِ جمعہ نکند گوش کسے نالۂ بیکاراں را
گریہ ما نیست اثر در دلِ راجہ جموں سبزہ بر سنگ نروید چہ گنہ باراں را
موذیاں کردہ ہجوم اے شہ دولہ فریاد تیغِ گجرات ہتر لیست دل آزاراں را

(پنجاب میں اردو ص ۲۸۲ از محمود شیرانی مطبوعہ ۱۹۹۰ء اترپردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ)

رانا سانگا نے ناگور میں اور ہیموں بقال نے نارنول میں مسلمانوں پر بڑے ظلم ڈھائے تھے۔ اورنگزیب کی وفات کے بعد راجہ اجیت سنگھ نے جودھپور کی تمام مساجد کو مسمار کر دیا تھا۔

والسلام

عبدالرؤف خاں

باب التقریظ والانتقاد

تاریخ شعرائے روہیلکھنڈ جلد اول تا چہارم

مرتبہ جناب سید تعظیم علی نقوی شایاںؔ بریلوی مرحوم، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت معمولی چاروں جلدوں کے مجموعی صفحات ۳۴۴۰، مجموعی قیمت ایک ہزار روپیے۔ فی جلد ۲۵۰ روپیے۔

اردو شعرا کے تذکرے ہر دور میں لکھے گئے ہیں، بعض تذکرے کسی ایک جگہ اور خاص علاقوں کے شعرا کے ذکر کے لیے مخصوص ہیں، یہ تذکرہ بھی اسی نوعیت کا ہے جس میں روہیلکھنڈ کے حسب ذیل سات اضلاع کے شعرا کا تذکرہ اور ان کا نمونۂ کلام دیا گیا ہے بدایوںؔ، بریلیؔ، بجنورؔ، پیلی بھیتؔ، رام پورؔ، شاہجہاں پور اور مرادآبادؔ

یہ خطہ علمی، ادبی اور لسانی حیثیت سے ممتاز رہا ہے اور یہاں بڑے بڑے اہل کمال پیدا ہوئے ہیں۔ جناب سید تعظیم علی نقوی شایاںؔ مرحوم کا تعلق بھی اسی مردم خیز علاقہ کے ضلع بریلی کے ایک علمی و ادبی گھرانے سے تھا ان کو شعر و ادب کا ذوق ورثے میں ملا ہے، ملازمت کی مشغولیت کے باوجود علم و ادب سے ان کا اشتغال برابر قائم رہا جس کا ثبوت یہ ضخیم تذکرہ ہے جو مصنف کی چالیس برسوں کی محنت کا ثمرہ ہے، اس کی اہمیت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ یہ تقریباً ساڑھے تین ہزار صفحات پر مشتمل اور چار ہزار دو سو نواسی (۴۲۸۹) شعرا کا تذکرہ ہے، اس طرح کا عظیم الشان کام عموماً ادارے یا اہل قلم کی ایک جماعت انجام دیتی ہے لیکن جناب شایاںؔ مرحوم کا

عزم و ولولہ اور ان کی ہمت اور لگن قابل ستایش ہے کہ انھوں نے اسے تن تنہا انجام دیا ہے، ان کی اس ادبی کاوش سے آیندہ تحقیقی کام کرنے اور اس سرزمین کی ادبی تاریخ لکھنے والے بے نیاز نہیں رہ سکتے، یہ ان کے لیے حوالہ و مرجع کا کام دے گی۔ لایق مصنف نے یہ اہم اور مشقت طلب علمی خدمت انجام دے کر آج کل کے آرام طلب اور سہولت پسند مصنفین کو بہت کچھ سبق دیا ہے۔

کتابوں کی تصنیف و تالیف سے زیادہ مشکل مرحلہ ان کی طبع و اشاعت کا ہوتا ہے، جناب شایاں مرحوم اس کتاب کی اشاعت سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہوگئے ان کے بعد یہ ادبی سرمایہ ان کے علم دوست، جواں سال و جواں ہمت خلف الرشید جناب عظیم القدر کو ورثہ میں ملا، انھوں نے اس کو شایع کر کے روہیلکھنڈ کے بشمار غیر معروف اور گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے شعرا کو نئی زندگی بخش دی اور ان کے نام نیک کو ضایع ہونے سے بچا لیا، حقیقت یہ ہے کہ اس تذکرہ کی تالیف و اشاعت اردو کے شیدائیوں اور خصوصاً اس علاقہ کی ادبی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔

یہ ضخیم کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد صرف بدایوں کے شعرا کے تذکرے کے لیے مخصوص ہے، دوسری جلد میں بریلی اور بجنور کے شعرا کا ذکر ہے۔ تیسری جلد میں بالترتیب پیلی بھیت، رام پور اور شاہجہاں پور کے شعرا کا حال درج ہے اور چوتھی جلد مرادآباد کے شعرا کے ذکر کے لیے خاص ہے۔

لایق مرتب نے صرف اردو شعرا ہی کے تذکرہ پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ عربی اور فارسی گو شعرا کا تذکرہ بھی کیا ہے بعض شعرا نے اردو اور فارسی دونوں میں

داد سخن دی ہے، ان کے تذکرہ میں ان کی یہ خصوصیت دکھائی گئی ہے لیکن عربی و فارسی گو شعرا کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ کتاب میں ہر دور کے شعرا کا تذکرہ ہے، اس طرح متقدمین، متوسطین اور متاخرین سب ہی شعرا کا ذکر اس میں آیا ہے اور زمانہ حال کے شاعروں کو بھی نظرانداز نہیں کیا ہے، کتاب کی ترتیب تاریخی لحاظ سے کی گئی ہے، تاکہ شاعری کے عہد بعہد ارتقا کا اندازہ ہو اور پھر جن شعرا کا تذکرہ دیا ہے ان کے تلامذہ کا ذکر بھی کیا ہے، خواہ وہ کسی خطہ اور علاقہ کے ہوں۔ اس طرح اس میں ہندوستان کی اکثر جگہوں کے شعرا کا ذکر آگیا ہے۔

فاضل مولف نے پہلی جلد کے شروع میں بطور مقدمہ پہلے باب میں روہیلکھنڈ کے تاریخی و جغرافیائی حالات بھی کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے۔

مقدمہ میں قدیم عہد سے روہیلوں تک اس سرزمین میں بود و باش اختیار کرنے والی قوموں کے غلبہ و تسلط کی سرگزشت تحریر کی ہے اور ان کی اہم یادگاروں اور عمارتوں کے بارے میں بھی معلومات قلمبند کیے ہیں، اس حصہ کے حواشی بھی قدر و قیمت کے حامل ہیں جن میں قدیم اور حجری دور سے لے کر مسلمانوں کے زمانے تک ہندوستان میں آنے والی قوموں، ان کے بادشاہوں اور مختلف خاندانوں کے حکمرانوں کے بارے میں مفید اور ضروری معلومات بیان کیے ہیں، اس طرح حبشی النسل، منگول، ڈراوڑ، آریہ، آریہ ادب، بودھ، جین اور مسلمان فرمانرواؤں اور متعدد حکمراں خاندانوں کا یہ مختصر مرقع بھی ہے۔

ہر ضلع کے شعرا کا تذکرہ مکمل کرنے کے بعد ان کے ناموں اور تخلص کے لحاظ سے اشاریہ بھی دیا ہے تاکہ مراجعت میں سہولت ہو۔

مصنف نے یہ سب مواد جمع کرنے اور ہزاروں شاعروں کے حالات یکجا کرنے میں جو کد و کاوش اور محنت و عرق ریزی کی ہے اس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے، ان کو ہند و پاک کے بعض نامور فضلا نے جو خراج تحسین پیش کیا ہے اور کتاب کے بارے میں جو تاثرات لکھے ہیں، ابتدا میں اس کا بھی تذکرہ ہے اس سے بھی مصنف کی محنت اور ان کے کام کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اتنی طویل و ضخیم کتاب میں خوبیوں کے باوجود اگر کمی بھی رہ گئی ہے تو اس سے اس کی اہمیت کم نہیں ہو سکتی ہے۔ یہاں چند کی نشاندہی اس لیے کی جارہی ہے تاکہ آیندہ اڈیشن میں تصحیح کر لی جائے۔

۱۔ کتاب کی ابتدا ضلع بدایوں کے عربی شعرا کے ذکر سے ہوئی ہے، اس میں سب سے پہلے مشہور محدث و لغوی حسن صغانی کا تذکرہ دیا گیا ہے گویا مصنف کے نزدیک ان کا وطن بدایوں تھا جو از روئے تحقیق صحیح نہیں ہے، مشہور فاضل مولانا عبدالحلیم چشتی نے پوری تحقیق سے صغانی کے بدایونی ہونے کی پرزور تردید کی ہے (ملاحظہ ہو معارف جلد ۱۴۳ عدد ۱) راقم نے بھی اس بے اصل و غیر محقق قول کی مدلل تردید کی ہے (دیکھئے تذکرۃ المحدثین جلد سوم ص ۳ تا ۱۳) یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

۲۔ ص ۱۹۸ و ۱۹۹ پر بدایوں کے شعرا کے ضمن میں مرزا عبدالقادر بیدل دہلوی کا تذکرہ درج ہے لیکن اس کی وجہ و مناسبت سمجھ میں نہیں آئی، بیدل سے پہلے مولانا شاہ عبدالماجد ماجد بدایونی اور ان کے دو تلامذہ حامد و احمد بدایونی کا ذکر تھا، ان میں اول الذکر ماجد بدایونی کے چھوٹے بھائی اور موخرالذکر ان کے فرزند تھے۔ اب یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے ساتھ بیدل کا تذکرہ کیوں کیا گیا ہے جبکہ نہ وہ خود

بدایونی ہیں اور نہ کسی بدایونی کے شاگرد ہیں، ماجد شاہ کا زمانہ مصنف کے بیان کے مطابق ۱۸۸۷ - ۱۹۳۱ء اور بیدل کا ۱۶۴۴ - ۱۷۲۲ء ہے اس لیے بیدل کے ان کے شاگرد ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

بیدل کے بعد ان کے شاگرد شیخ سعد اللہ گلشن اور ان کے تلامذہ خواجہ ناصر عندلیب دہلوی اور ولی گجراتی نیز ان دونوں کے بعض غیر بدایونی تلامذہ کا تذکرہ ہے جو ظاہر ہے غیر متعلق اور بے جوڑ ہے، اسی طرح بعض اور غیر متعلق اشخاص کا تذکرہ بھی ہے۔

۳۔ ص ۲۰۴ پر ولی گجراتی کا تذکرہ ہے، ان کا نام شاہ ولی اللہ لکھا ہے، یہ درست ہے کہ بعض تذکرہ نگاروں نے ان کا یہ نام بھی لکھا ہے مگر ان کے نام کے بارے میں ارباب تذکرہ کا اختلاف ہے اور ابھی تک محققین یہ طے نہیں کر سکے ہیں کہ ان کا اصل نام کیا تھا اس بنا پر شایاں صاحب کو قطعیت کے ساتھ ولی کا نام شاہ ولی اللہ لکھنا درست نہیں ہو سکتا، انہیں اس کے متعلق تذکرہ نگاروں اور محققین کے اختلاف کا بھی ذکر کرنا چاہیے تھا، جس شاعر کے شاہ ولی اللہ نام ہونے پر اتفاق ہے ان کا تخلص اشتیاق تھا، یہ سرہند میں پیدا ہوئے تھے اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خانوادے سے تھے، ان کی نشو و نما دہلی میں ہوئی تھی۔

۴۔ ص ۱۰۱ پر مولانا شہاب الدین مہمرہ بدایونی کا تذکرہ ہے، اس ضمن میں فخر الملک عمید تولکی کا ذکر بھی آگیا ہے، راقم کو تولکی نسبت کے سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ اس بارے میں تذکرہ نگاروں کا بڑا اختلاف ہے لیکن اس زمانہ کے مشہور فاضل محقق پروفیسر نذیر احمد نے قطعیت کے ساتھ لکھا ہے کہ عمید کی صحیح نسبت لویکی ہے جو وطن کے بجائے حسب کی طرف ہے (ملاحظہ ہو معارف جلد ۱۱۷ عدد ۳ ص ۱۸۹ و ۲۲۲)

مصنف نے عمید کا سنہ بھی تحریر کیا ہے جو یہ ہے ۶۴۸ھ/۱۲۵۰ء، اب یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ سن ولادت ہے یا وفات؟ عام اہل تذکرہ نے سن ولادت ۶۵۵ھ بتایا ہے، لیکن موجودہ محققین کے نزدیک صحیح سنہ ۷۰۱ھ ہے۔

اگر مصنف نے ۶۴۸ھ کو سن ولادت مانا ہے تو انہیں اس کی تصریح کرنی چاہیے تھی۔ آگے انھوں نے اسی انداز سے امیر خسرو کا سنہ ۷۲۵ھ/۱۳۲۴ء تحریر کیا ہے، گو انھوں نے کوئی تصریح نہیں کی ہے مگر خسرو کا سن وفات ۷۲۵ھ ہے، کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ انھوں نے ۶۴۸ھ عمید کا سن وفات دیا ہے جو درست نہیں ہو سکتا لیکن اگر وہ سن ولادت ہے تو مصنف کو سنین کے بارے میں یکسانیت کا لحاظ رکھنا چاہیے تھا یعنی یا تو ہر شخص کے سن ولادت کا ذکر کرتے یا اس کے سن وفات کا۔ بہر حال جس کا بھی ذکر کرتے اس کی صراحت کر دیتے۔

۵۔ انتخاب اور نمونۂ کلام دینے میں بھی یکسانیت ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے، چنانچہ بعض شاعروں کا کلام متعدد صفحوں پر مشتمل ہے، لیکن بعض کا نمونۂ کلام بہت کم دیا گیا ہے، ممکن ہے بعض شعرا کا کلام زیادہ دستیاب نہ ہوا ہو لیکن بعض معروف شعرا کا کلام تو متداول ہے پھر ان کا نمونۂ کلام دینے میں کیا مانع تھا، جیسے ماہر القادری (ص ۷۹) کا تذکرہ بھی مختصر ہے اور نموتاً صرف ایک شعر دیا ہے، جبکہ متعدد معروف اور بعض غیر معروف شعرا کا کلام کئی صفحوں میں درج ہے، اس طرح کی کتابوں میں اولاً تو یکسانیت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، ثانیاً کلام کا نمونہ کم سے کم دینا چاہیے تاکہ کتاب زیادہ ضخیم نہ ہو جائے۔

۶۔ شعرا کا تذکرہ قلم بند کرنے میں بھی اس اصول کو نظر انداز کر دیا ہے چنانچہ اکثر شعرا کا تذکرہ بہت مختصر ہے بلکہ بعض کا تو صرف نام اور تخلص لکھ دینے پر اکتفا کیا ہے، تلاش و تفحص کے بعد بھی جن شعرا کے حالات نہیں ملے ان کے بارے میں کم از کم اس کی وضاحت ہی کر دینی چاہیے تھی، ہمارے خیال میں اگر مزید کد و کاوش سے کام لیا جاتا تو چاہے ہر ایک کے نہ سہی لیکن اکثر کے بقدر ضرورت حالات مہیا ہو سکتے تھے، اگر آئندہ اڈیشن میں مصنف کے لائق فرزند اس کمی کو پوری کر دیں تو کتاب کی عظمت دو چند ہو جائے گی، بعض شعرا کا صرف تخلص درج ہے اور ان کے کسی قدر حالات اور نمونۂ کلام بھی دیا ہے لیکن نہ ان کا نام لکھا ہے اور نہ ان کے سنینِ ولادت و وفات کا ذکر ہے (یہ کمی اکثر نظر آئی) جیسے گوہری بدایونی (ص ۱۳۰) بہت سے معروف شعرا کا تذکرہ کئی صفحوں میں پھیلا ہوا ہے، حالانکہ معروف شعرا کے حالات سے عموماً واقفیت ہوتی ہے اس لیے ان کا مفصل تذکرہ قلم بند کر کے کتاب کی ضخامت بڑھانے سے کیا فائدہ؟

۷۔ کتاب میں عربی شعرا کا ذکر تو محض برائے نام ہے تاہم جن دو چار کا ذکر ہے، اردو اور فارسی شعرا کی طرح ان کے کلام کا نمونہ بھی پیش کیا جانا چاہیے تھا۔

۸۔ کتاب کی ترتیب بھی زیادہ ڈھنگ اور مناسب انداز سے نہیں کی گئی ہے، ترتیب کی ناہمواری قارئین کی الجھن کا باعث ہو گئی ہے، اسے بہتر بنانے کے لیے ضروری تھا کہ ہر شاعر کا تذکرہ الگ صفحے سے کیا جاتا اور اس کا نام سطر کے درمیان میں جلی لکھا جاتا پھر ذیلی عنوان کے تحت بقدر ضرورت اختصار اور جامعیت کے ساتھ اس کے مختصر حالات اور کمالات تحریر کر کے دوسرے ذیلی عنوان

کے تحت نمونۂ کلام دیا جاتا۔ اس کے بعد تلامذہ کا جلی عنوان قائم کر کے نمبروار ان کے حالات دو چار سطروں میں لکھ کر دو چار اشعار نمونتاً پیش کر دیتے۔

۹۔ تحریر میں بھی ناہمواری اور ژولیدہ بیانی ہے، اس کو ماقل و ماول اور حشو و زوائد سے پاک ہونا چاہیے تھا جس کی ایک پختہ مشق اہل قلم سے توقع تھی، ایک جگہ تحقیق کو تذکر لکھا ہے (حاشیہ ص ۲)

۱۰۔ انتخاب اور نمونۂ کلام بھی زیادہ معیاری نہیں ہے، عموماً رطب و یابس ہر طرح کا کلام جمع کر دیا گیا ہے۔

۱۱۔ سرورق اور اس کے بعد کے اندرونی صفحہ پر جہاں کتاب کا نام لکھا ہے وہاں جلدوں کی صراحت کے ساتھ اس کو بھی تحریر ہونا چاہیے تھا کہ اس جلد میں کس جگہ کے شعرا کا تذکرہ ہے۔

۱۲۔ مصنف نے جا بجا مراجع و مصادر کا ذکر کیا ہے لیکن اس کا مکمل اہتمام نہیں کیا ہے، اس لیے بہت سی جگہوں پر حوالے درج نہیں ہیں، کتاب کے استناد کے لیے حوالے دیے جانے کا اہتمام ضروری تھا۔

ہمارا مقصد خوردہ گیری نہیں ہے، اس بنا پر مزید فروگزاشتوں سے قطع نظر کرتے اور اس کی درخواست کرتے ہیں کہ دوسری اشاعت میں ان کی تصحیح کر لی جائے۔

مطبوعات جدیدہ

الفرقان خصوصی اشاعت بیادگار حضرت مولانا مفتی نسیم احمد فریدی مرحوم مرتبہ جناب خلیل الرحمن سجاد ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ کتابت وطباعت، صفحات ۲۰۸، قیمت ۲۵ روپیہ، پتہ: ماہنامہ الفرقان، نظیرآباد لکھنؤ۔

اردو کا ممتاز دینی مجلہ الفرقان تقریباً نصف صدی سے اپنے اصلاحی و مذہبی مضامین کے ذریعہ دین کی مفید خدمت انجام دے رہا ہے، اس پورے عرصہ میں اسے ہندوستان کے اچھے اہل علم و قلم کا تعاون حاصل رہا، ان میں مولانا نسیم احمد فریدی مرحوم کا نام نمایاں ہے، اس خاص نمبر میں مولانا مرحوم کے حالات وسوانح کا مرقع پیش کیا گیا ہے مولانا نے الفرقان کے مضامین میں حضرت مجدد الف ثانیؒ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور اکابر علمائے دیوبند کے حالات و افکار کی اشاعت کو اپنا خاص موضوع بنایا تھا، ان کی تحریروں میں جذبۂ باطن اور سوز دروں کی وجہ سے خاص حلاوت و جاذبیت اور تاثیر ہوتی ہے، ان کی ذاتی زندگی سادگی، تواضع اور منکسر المزاجی کا نمونہ تھی، زیر نظر اشاعت میں مولانا کی سیرت و شخصیت کے ان مختلف پہلوؤں کو مختلف ممتاز اہل علم و قلم نے نمایاں کیا ہے، قطب الدین ملا نے مولانا مرحوم کے الفرقان میں شایع شدہ تمام مقالات کا اشاریہ مرتب کیا ہے، مولانا مرحوم کا ایک مضمون بھی درج ہے جو مولانا ابوالحسن زید دہلوی کی تصنیف "مولانا اسمٰعیل دہلوی اور تقویۃ الایمان" پر مفصل تبصرہ ہے، ماہنامہ الفرقان نے یہ خاص نمبر شایع کرکے اپنے ایک بے لوث محسن کی قدر شناسی کا حق ادا کر دیا ہے۔

سوانح حضرت مولانا سید شاہ محمد امان اللہ قادری پھلواروی از جناب ہلال احمد قادری پھلواروی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ، خوبصورت کتابت وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۵۰۴، قیمت چالیس روپیے، پتہ: دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ۔

پھلواری شریف کی خانقاہ مجیبیہ علم و عمل اور رشد و ہدایت کا ایک مشہور مرکز ہے اس خانقاہ کے ارباب عرفان شاہ بدر الدینؒ، شاہ محی الدینؒ، شاہ قمر الدینؒ اور شاہ محمد نظام الدینؒ وغیرہ اپنی مذہبی، تبلیغی، ملی اور قومی خدمات کے لیے پورے ملک میں مشہور تھے، چند برس پہلے اس کے سجادہ نشین مولانا شاہ محمد امان اللہ قادریؒ کا انتقال ہوا تھا، زیر نظر کتاب میں ان کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے علاوہ ان کے اخلاق اور سیرت و شخصیت کے پر کیف واقعات جمع کیے گئے ہیں اور ان کی قومی و ملی خدمات کا بھی ذکر کیا گیا ہے، مصنف ابھی نو عمر ہیں لیکن کتاب سے ان کے سلیقہ اور اچھے ذوق کا پتہ چلتا ہے، ایک حصہ میں صاحب تذکرہ کی بعض تحریروں کو جمع کر دیا گیا ہے، تعزیتی خطوط اور تحریروں کے علاوہ مولانا عبداللہ عباس ندوی کے شگفتہ قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے۔

وفیات مشاہیر پاکستان از جناب پروفیسر محمد اسلم، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور کتابت وطباعت، مجلد صفحات ۳۲۱، قیمت ۱۰۰ روپیے، پتہ: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان۔

قدماء کے دور سے اب تک وفیات نگاری کا سلسلہ برابر جاری ہے زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، کئی برس سے فاضل مرتب نے قبروں اور مزاروں

کے الواح وکتبات کی مدد سے وفیات نویسی کا جو دلچسپ اور منفرد کام شروع کیا تھا انکو
علمی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔ زیر تبصرہ کتاب اسی کا مجموعہ ہے اس میں انھوں نے
۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے ۱۴ اگست ۱۹۸۷ء تک وفات پانے والے پاکستانی مشاہیر کا احاطہ کیا ہے
انکا تعلق علم وادب، فنون لطیفہ، سیاست یا دوسرے کسی شعبۂ زندگی سے تھا، الواح مزار کے
علاوہ اخبار ورسائل اور دوسرے مستند حوالوں کی مدد سے جامع اختصار کے ساتھ انھوں نے
یہ جدید وفیات الاعیان مرتب کی ہے، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے متعلق معلومات اسطرح
دیے گئے ہیں "سلیمان ندوی، علامۂ سید، مصنف سیرۃ النبی، مدیر ماہنامہ معارف اعظم گڈھ
ولادت ۱۸۸۴-۱۱-۲۲ دیسنہ (بہار) وفات ۱۹۵۳-۱۱-۲۲ اسلامیہ کالج، کراچی
(تذکرۂ سلیمان مصنفہ غلام محمد) اس سے کتاب کی نوعیت کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

اردو میں ادب اطفال، ایک جائزہ از جناب پروفیسر اکبر رحمانی، متوسط تقطیع
عمدہ کاغذ، کتابت وطباعت مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۱۶، قیمت ۳۵ روپئے پتہ:
ایجوکیشنل اکادمی، اسلام پورہ، جلگاؤں، مہاراشٹر۔

بچوں کی تعلیم وتربیت، انکے ذہن ومزاج کی تشکیل، انکی تدریس کے نفسیاتی اصول اور انکا
ادب، فاضل مولف کا خاص اور پسندیدہ موضوع ہے جس پر وہ اپنے علم ومطالعہ کے قیمتی تجربات
واحساسات کو اپنے رسالہ آموزگار میں برابر پیش کرتے رہتے ہیں، کچھ عرصہ پہلے انھوں نے آموزگار
کا ادب اطفال نمبر شایع کیا تھا، اب اس نمبر کو مزید فائدے کیلئے کتابی صورت میں شایع کیا ہے جو
پروفیسر ظ انصاری، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر معین الدین، میرزا ادیب، ڈاکٹر اسد اریب
اور سیفی پریمی وغیرہ اہل قلم کی تحریروں کا مجموعہ ہے، اس میں ادب اطفال کے فروغ اور اس راہ کی
مشکلات ومسائل کو دور کرنے کی مفید تدبیریں بتائی گئی ہیں خود فاضل مرتب نے اردو میں
بچوں کے ادب کا سیر حاصل تنقیدی جائزہ لیا ہے یہ کتاب اردو کے تعلیمی حلقوں میں پذیرائی وقدردانی کی مستحق ہے۔

(ع-ص)